افکار



The

MONTHLY

AFKAR

BHOPAL

سرخیاں

جلد ۸
شمارہ ۲

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبالؔ)

اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء

ماہنامہ **افکار** بھوپال

زر سالانہ چھ روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

نگراں: حکیم سید قمرالحسن

ادارہ: رشدی۔ صہباؔ

افــــــــــــکار

کا

پہلا خاص نمبر

دنیائے ادب میں چکا چوند پیدا کرچکا ہے

اب

دوسرے خاص نمبر کا انتظار کیجئے

جس کی تیاریاں شروع کردی گئی ہیں

افکار — کے خاص نمبر کو اردو زبان کے اس بحرانی دور میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہوگا —

تفصیلات معلوم کیجئے —

منیجر افکار بھوپال

اشاریہ

تہذیب و ادب پر حملہ!

ہندوستان کے تمام ادبی اور صحافتی حلقوں میں حکومت مغربی پنجاب کے اس ادب کش اقدام کی سخت ترین مذمت کی جا رہی ہے جس کے ذریعہ لاہور کے تین بلند پایہ ادبی رسائل "نقوش" - "سویرا" اور "ادب لطیف" کی اشاعت چھ ماہ کے لئے بند کر دی گئی ہے۔ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ یہ پابندی پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت عائد کی گئی ہے، یہ بات فہم سے بالاتر ہے کہ ان رسائل کے مضامین سے آخر کونسی ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی تھی اور "نقص امن" کو کتنا بڑا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، حکومت کے وہ کونسے سیاسی مقاصد تھے جنھیں ان جرائد کی بیباک نگاری اور ادبی سرگرمیوں سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا؟ - یہ تینوں رسائل علمی اور ادبی ہیں اور ان کا مقصد ادب کی خدمت کرنا ہے، وہ ادب کی بدلتی ہوئی قدروں اور جدید و ترقی یافتہ ثقافتی رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں، مغربی پنجاب کی حکومت نے تہذیب و کلچر، ادب و صحافت اور آزادئ تحریر و تقریر پر جس نوعیت کی بندشیں لگائی ہیں انھیں کسی بھی جمہوری ملک میں منصفانہ نہیں کہا جا سکتا۔ فکر و نظر کا اختلاف ہمیشہ رہا ہے اور تعمیری و جائز نکتہ چینی کا حق کبھی نہیں چھینا جا سکتا۔ پاکستان اب اُردو کا گہوارہ بن رہا ہے۔ اس صورت میں خالص ادبی و علمی جرائد کے متعلق ایسا فسطائی رویہ اختیار کرنا دور اندیشی اور تدبر کی علامت نہیں —— بہر حال ہمیں یقین ہے کہ حکومت مغربی پنجاب جلد اپنی غلطی کا احساس کر کے ان مطبوعات کے خلاف اپنا ناعاقبت اندیشانہ تعزیری اقدام واپس لے لیگی۔ زندہ اور آزاد قومیں اپنے تہذیب و ادب کی قدر کرتی ہیں کیونکہ اس سے ان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے —— وہ صحت مند اور حقیقت پسندانہ نکتہ چینی سے متوحش ہو کر ایسے اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کرتیں، اس لئے کہ ادب و صحافت کے ذریعہ ہی سے رائے عامہ کو سنوارا جا سکتا ہے۔

★ ★ ★

بھوپال کی صحافت

پنڈت چتر نارائن نائب وزیر اعظم بھوپال نے اپنی ایک تازہ تقریر میں جسے مولانا ارشد تھانوی نے ازراہ کرم ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا ہے، فرماتے ہیں "آپ خوب نکتہ چینی کیجئے، میں وہ ہنس بننا چاہتا ہوں جو پانی کو چھوڑ دیتا اور دودھ پی لیتا ہے، جو چیز غیر ضروری ہوگی وہ میں کبھی نہیں لوں گا، اس حکومت کے ہاتھ میں اب بھی وہ قانون ہے جس سے انگریزی حکومت اخبارات کا منہ بند کر دیا کرتی تھی لیکن ہم کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے جیسا پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ اخبارات کو تہذیب کا پابند ہونا چاہئے، ہم آزاد ہیں لیکن آزاد آدمیوں کی طرح رہنا چاہئے اس کی ذمہ داری ہم سب پر ہے ہمیں یہاں کے صحافتی معیار کو بلند رکھنا چاہئے۔ ہمارے یہاں کے اخبار جب یہ سرخی لکھتے ہیں کہ "تیر چلا لو پھنسا تو کیوں کٹ پیسی بٹیر" اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کس قدر پیچھے ہیں ——"

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ پنڈت جی نے کبھی یہاں کے معیار صحافت کو بلند کرنے کی طرف بھی توجہ دی ہے؟ آخر اس صحافتی پستی کے اسباب و علل کیا ہیں؟ ہمیں بھی مبتذل اور گندہ صحافت سے نفرت ہے، جس کا مقصد صرف پگڑیاں اچھال کر اپنی مطلب برآری ہوتا ہے بھوپال میں صحافت کا معیار کیوں بلند نہیں ہو سکا - اس کی وجہ بہت صاف ہے - یہاں صحافتی اداروں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی یہاں اخبارات کو اعلیٰ پیمانہ پر مہذب طریقہ سے شائع کرنے کی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ حکومت نے کیا کبھی اخبارات کے صحیح نمائندوں سے مشورہ کر کے ان کی کاغذ اور طباعت کی مشکلیں دور کرنے کی کوشش کی ہے؟ یہاں کے پریس اچھے اخبارات چھاپنے سے قاصر ہیں۔ بھنڈاری پریس معیاری جرائد چھاپنے سے انکار کرتا ہے۔ اتفاقی پریس اخبارات سے جی چراتا ہے اور آجکل تو وہ "معطل" ہی ہے۔

سرکاری پریس میں کام کا معیار اونچا نہیں اور بقیہ چھوٹے موٹے پریس اچھی طباعتی صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ حکومت کی عدم توجہی کے پریس ایڈوائزری بورڈ کے اراکین نے ایک عرصہ سے استعفے دے رکھے ہیں اور انھوں نے جو جائز شکایات پریس اور حکومت کے رابطہ کے متعلق پیش کی ہیں۔ اُن پر آج تک غور نہیں کیا گیا۔ عوامی حکومت کے دور میں پریس سے اس قسم کی غفلت کے نتیجہ میں جو صحافتی نمونے منظر عام پر آئیں گے ظاہر ہے کہ اُن سے ملک اور قوم کی ترجمانی کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ ہم پنڈت جی سے گذارش کریں گے کہ محض یہ کہدینے سے کہ صحافتی معیار کو اونچا اُٹھانا چاہیئے، کام نہیں چل سکتا، ضرورت عمل کی ہے۔ صحافت ایک آرٹ ہے اور جب تک آپ کا تعاون اور آپ کی امداد اسے حاصل نہیں ہوگی وہ حسن و خوبی سے محروم رہیگا۔

★ ★ ★

مزدور تحریک

پچھلے چند ماہ سے بھوپال کی مزدور تحریک کو جس قسم کے بحرانی دور سے گذرنا پڑا ہے وہ ایک طویل داستان ہے۔ سرمایہ اور محنت کی ٹکر ہمیشہ موجب اضطراب ثابت ہوئی ہے اور سرمایہ دار نے نت نئے طریقوں سے مزدور کو اپنے دام تزویر میں پھانسنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کے دیگر مقامات کے مزدوروں کی طرح بھوپال کے مزدوروں کو بھی مصائب و نوائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہاں کی مزدور تحریک کو بھی انجام کار دو حصوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ ان کی طاقت منتشر ہو جائے اور ان کے حقوق کی مانگ ہلکی پڑ جائے۔ چنانچہ مزدور سبھا کے مقابلہ میں اب ایک مزدور سنگھ لا کھڑا کر دیا گیا ہے، جس کے پس پشت کہا جاتا ہے کہ بھوپال ٹیکسٹائل لمیٹیڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر ورما کا ہاتھ کام کر رہا ہے اور وہ مزدور تحریک کے ترقی پذیر رجحانات سے گھبرا کر ایسے عناصر سے گٹھ جوڑ کر رہے ہیں جو ہر معاملہ میں ان کی ہمنوائی کر سکیں۔ لال اور ترنگے جھنڈے میں خواہ مخواہ افتراق ظاہر کر کے سادہ لوح عوام کو فریب دینے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ لال جھنڈے کو خونی نشان بتایا جا رہا ہے حالانکہ وہ عالمگیر انقلابی مزدور تحریک کی نشانی ہے۔ سوال یہاں جھنڈوں کا نہیں بلکہ مزدوروں کی طاقت کو کمزور کرنے اور اُن میں افتراق پیدا کرنیکا ہے، ——— سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے بل بوتہ پر بہت کچھ کر گذرنے کا ادعا کر رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کی رجعت پسندی اُن "انقلابی" دھاروں کو نہیں روک سکتی جنھیں ظلم و تعدی، تشدد اور استحصال کے ناقابل برداشت بوجھ سے دبے اور کچلے ہوئے عوام نے، طوفان کی شکل دیدی ہے۔

(ادارہ)

★ ★ ★

اختر شیرانی!

اختر شیرانی کی وفات سے اُردو ادب ایک رنگین اور رومانی شاعر سے محروم ہو گیا ہے۔ اختر نے اپنے رنگ تغزل اور نظم نگاری سے ایک ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا اور اسے اُردو کا کیٹس کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کے دلکش نغمے اور سہانے گیت نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بن گئے تھے، ——— خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے گلکدۂ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نشاط شاہدوی!

دوسری المناک خبر مالیگاؤں سے نشاط شاہدوی کے انتقال کی آئی ہے۔ نشاط ہونہار ترقی پسند شاعر تھا۔ اس کی شاعرانہ صلاحیتیں اُبھرتی جا رہی تھیں کہ اجل کے جھونکے نے اس کو ابدی نیند سلا دیا۔ خداوند کریم اس کی روح کو سکون بخشے، اور غم زدہ اعزا کو صبر دے!

(ادارہ)

سنگ و خشت

دیرش

لیجئے آپ کے مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر "انقلاب" لاہور کے "افکار و حوادث" حاضر ہیں: ——— "تسنیم"۔ "کوثر"۔ "آغاز" پہلے چھ مہینہ کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ اب "سویرا"۔ "ادب لطیف" اور "نقوش" بھی اسی مدت کے لئے ممنوع الاشاعت قرار دیدیئے گئے ہیں۔

خیال یہ ہے کہ تین تین کر کے لاہور کے تمام اخبارات اور رسالے تین تیرہ کر دیئے جائیں گے اور آخر میں صرف تین ہی باقی رہ جائیں گے جن کو مسلم لیگی وزارت کی بارگاہ جلال میں خصوصیت خاصہ حاصل ہے۔

لیکن ان تین کو بھی بیفکر نہ رہنا چاہئے، جب ناز و کرشمہ کی تیغ بےزنہار چل رہی ہو تو کسی کی سلامتی بھی یقینی نہیں ہوتی، وہ اپنوں اور بیگانوں پر یکساں وار کرتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ عبدالقیوم سرخپوشوں کے ساتھ ساتھ مسلم لیگیوں کا بھی تیا پانچا کئے جا رہا ہے! ایک دن ایسا آئیگا کہ ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی ؛ مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

(محض اتفاق ہے کہ "ناز" نوائے وقت، احسان، اور زمیندار کے پہلے حروف کا مجموعہ ہے۔)

★ ★ ★

کیا یار لوگوں کا منشا یہ ہے کہ لاہور میں ایک بھی اخبار رسالہ باقی نہ رہے؟ الا "استقلال"! ——— پچھلے دنوں ڈائرکٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ "استقلال" کے لئے مقام فخر ہے کہ اس کی کثرت اشاعت نے معاصرین کو شکایت کا موقع دیدیا ہے۔ اس سے زیادہ کسی اخبار کی کامیابی کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اگر اخباروں اور رسالوں کی بندش کا یہی حال رہا تو مغربی پنجاب کے لوگ "استقلال" کے سوا کسی اخبار کو نہ خریدیں گے۔ کیونکہ کوئی اخبار موجود ہی نہ ہوگا ——— "استقلال" والوں کے لئے کتنا پر فخر تصور ہے کہ بازار میں نہ "نوائے وقت" ہو۔ نہ "زمیندار" نہ "احسان"۔ نہ "انقلاب"۔ نہ "امروز"۔ نہ "تسنیم"۔ نہ "آغاز" نہ "مغربی پاکستان"۔ بس ہر طرف "استقلال" ہی کا آوازہ بلند ہو۔

★ ★ ★

پنجاب میں دیہاتی عشق کی ایک داستان "مرزا اور صاحباں" کے نام سے مشہور ہے۔ اس داستان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عاشق معشوق اور دوسرے کرداروں کی کیفیت خالص دیہاتی اور ان کے جذبات ان گھڑ اور قدرتی ہیں۔ مثلاً ایک زمانہ میں ہم نے ایک گیت سنا تھا۔

حجرے شاہ مقیم دے	ایک جٹی عرض کرے
بکرا دیانگی پیر دا	جے سر دا سائیں مرے
پنج ست مرن گوانڈھناں	رہندیاں نوں تاپ چڑھے
کتی مرے فقیر دی	جیہڑی نت چوں چوں کرے

تے گلیاں ہو ون سنیاں
تے وچ مرزا یار پھرے

★ ★ ★

یعنی حضرت شاہ مقیم کے حجرے میں ایک جٹی عرض کر رہی تھی کہ اگر میرا شوہر مر جائے تو میں پیر کے لئے ایک بکرا صدقہ کروں گی پانچ، سات پڑوسنیں مر جائیں اور جو باقی رہ جائیں انھیں تپ چڑھ جائے۔ فقیر کی کتیا بھی مر جائے۔ جو ہر وقت چاؤں چاؤں کرتی رہتی ہے۔ گلیاں سنسان ہوں اور ان میں میرا عاشق مرزا گھوم پھر رہا ہو۔

کچھ اسی قسم کی ذہنیت مغربی پنجاب کی حکومت کے "شعبہ تعزیر اخبارات" کی ہے۔ وہ لوگ تندرست سکون نہیں چاہتے قبرستان کی سی خاموشی چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ سرکاری اور نیم سرکاری پرچوں کے سوا کوئی دیانتدار اور آزاد اخبار زندہ نہ رہے ——— لیکن آخر تا بکے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کی حرکات کا اثر صرف چند روزہ ہوتا ہے اور بالآخر فتح حریت و جمہوریت ہی کی ہوتی ہے۔ حیف ہے ان لوگوں کو پر جو آج اس غلط پالیسی کی حمایت کر کے تاریخ میں اپنے نام برائی کے ساتھ لکھوا رہے ہیں۔

★ ★ ★

قائدِ اعظم!

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیِ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(اقبال)

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

اشعار

(جو غزل نہ بن سکے)

عشق سے گرمیاں حیات کی ہیں		ساری تفصیلیں ایک بات کی ہیں

★

زمین خُلد میں تبدیل ہوتی جاتی ہے		حیات خون میں تحلیل ہوتی جاتی ہے

★

جاگنا ہے ابھی بہاروں کو		نیند کیوں آ چلی ستاروں کو

★

ہر ایک شے پہ اُجالا سا ہلکا ہلکا ہے		ترا خیال ہے یا صبح کا دھندلکا ہے

★

خون سے چہرے اُرغوانی ہیں		یہی انسان غیر فانی ہیں

★

تجھے نصیب ہو تیری بہار سامانی		مِری خزاں سہی مگر قصۂ بہار نہ پوچھ

★

وہ جن کو لوگ حقیقت پرست کہتے ہیں
حقیقتوں کے تصور میں مست رہتے ہیں

احمد ندیم قاسمی

جُدائی

[بنجارہ دوسرے مذہب کا فرد ہے جو جبریہ اپنے گھر سے نکالا جا رہا ہے۔ کسان دوسرے مذہب کے ہیں، وہ متحیر ہیں۔ رنگا چار یہاں سوانگوں میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو کومن ٹیٹر (Commentator) کی ہوتی ہے]

—: رنگا چار :—

ٹانڈہ چھوڑ چلا بنجارہ
کت بستی کو چلی سواری
دیس اُجڑا پردیس کو دھایا
لُٹ گئی باغ بہاری
لُٹ گئی باغ بہاری سجنو لُٹ گئی باغ بہاری
ٹو ٹُٹ گئے ٹانڑ چھن گئے
چھن گئی سُندر ناری
مات پتا کے ہاڑ بھی چھوڑے
چھوٹی بھومی پیاری
چھٹ گئی بھومی پیاری سجنو چھوٹی بھومی پیاری

—: کسان :—

مت پردیس کو جا نردوشی
کب جانا تیرا چاہیں!
کہے تو دھرتی تیری جوتیں
بھیت پہ چھپر چھائیں
بھیت پہ چھپر چھائیں رے پیارے بھیت پہ چھپر چھائیں
ٹو دیکھیں ٹانڑ ڈھونڈیں!
دوجا تیرا بیاہ رچائیں!
گام جو اُجڑا پھر بس جائے
ایسی راہ چلائیں ہو
ایسی راہ چلائیں رے پیارے ایسی راہ چلائیں

—: رنگا چار اور کسان :—

ہاتھ جوڑ بنجارہ کہوے
"من تو دیس بسیّا"
دیس سے کاڑھن ہارے وہ ہے
تم سب اپنے بھیّا"
تم سب اپنے بھیاری سجنو تم سب اپنے بھیا
ناؤ ہلائی بندر بانٹ پر
وہ ہی اپنے ناؤ کھویا ہو
جب جمنا میں دھارا پھیلے
کس سے کریں دھمیّا!
کس سے کریں دھمیاری سجنو کس سے کریں دھمیا
بوہرے بھاگے پاکستان سے
اِت کے بوہرے اُت کو جائیں
جن ہٹھیا پر پیسہ ٹکا دیں
داہی میں آگ لگائیں!
داہی میں آگ لگائیں رے سجنو داہی میں آگ لگائیں
ان کے واڑی سب رجواڑے
ان کے واڑی پولیس سپاہی
تم تو ردکا، وہ میرے کاڑھا
تم میں سکت نہیں ہے بھائی
تم میں سکت نہیں ہے سجنو تم میں سکت نہیں ہے بھائی

—: رنگا چار :—

اتنا کہہ بنجارہ چل دیا
روتے رہ گئے دیس کسان
اب کے بچھڑے کب ملتے ہیں
ہردے میں یہی ارمان
ہردے میں یہی ارمان رے سجنو ہردے میں یہی ارمان

سید مطلبی فرید آبادی

۱ گناہ ۲ دیوار ۳ اہل وطن ۴ نکالنے والے ۵ گردن ۶ ہنگامہ ۷ سرمایہ دار ۸ بستی۔

اپنے محبوب کے نام

وہ گیت جاگے، وہ ساز کھنکے
وہ رقص کرنے کو پاؤں ابھرے
وہ باہیں اُٹھیں، وہ سینے تھرکے
وہ مسکراہٹ کے تیر لپکے
لچک تھرک سے کمر نے جھولے جھلائے سب کو
نچیلے پیکر سنہرے آنچل اُڑا کے گھومے
گھٹائیں جھومیں شراب پی کر
گگن سے پریاں اتر کے آئیں اور اپنے ہاتھوں سے موتیوں کی پھوار برسائی مسکرا کر
گھنے درختوں کے جھنڈ کی جھومتی ہوئی شاخہائے رنگیں ندی کی لہروں کو چوم آئیں
ہوا کے جھونکے تھرکتے آئے
مرے دریچے کے پار کھیتوں میں ننھے ننھے حسین پودوں نے سر ہلائے
کہیں کسی خوش گلو پرندے نے اپنے محبوب کی جدائی میں گیت گائے
شباب کی مستیوں سے بہکی ہوئی نگاہوں نے جھلملا کر محبتوں کے دیئے جلائے

(۲)

مری نگاہوں میں ایک سپنا ابھر رہا تھا
کہ جیسے تم مجھ سے کہہ رہی تھیں!
چلو چلیں ہم ندی کنارے
وہاں میں جھونکوں کے ساز پر ایک گیت گاؤں گی — الفتوں کا جمیل نغمہ
تمہارے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں کی رس بھری لذتیں چکھاؤں گی — سن رہے ہو؟
چلو چلیں ہم لچکتی پگڈنڈیوں پہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
وہاں میں تم کو مسرتوں کی مہکتی کلیوں کے ہار پہناؤں گی — چلو گے؟
چلو چلیں ہم ہوا کی موجوں پہ اُڑتے اُڑتے، حسین ساز وں کو چھو کے آئیں
چلو چلیں ہم، چلو چلیں ہم

(۳)

مگر مری جاں!
یہ کیسی سرگوشیاں ہیں جو مجھ سے کہہ رہی ہیں
کہ اس گھڑی بھی تمہاری پلکوں پہ اشک آنکھیں چھپا رہے ہیں!
کہ اس گھڑی بھی تمہارے ہونٹوں پہ آہیں پیہم سسک رہی ہیں!!
کہ اس گھڑی بھی تم اپنی دھڑکن کی آہ و زاری کو سُن رہے ہو!!!

(۴)

میں رو رہا ہوں
سسک رہا ہوں
تڑپ رہا ہوں
کہ اس گھڑی تم مری نگاہوں سے دور اک اجنبی کی آغوش میں پڑی ہو
اسی کے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھے اسی کو لذت چکھا رہی ہو
تمہاری زلفوں سے اجنبی ہاتھ کھیلتے ہیں
تمہاری نظروں کا جھمگٹا، ہوا تبسم
مرا نہیں ہے، مرا نہیں ہے
مرے لئے تو سسکتی تنہائیاں ہیں، یادیں ہیں، اشک ہیں اور سونی راتیں!!

(۵)

ہوا کے جھونکو! حسیں پھوارو!! مرے دریچے کے پاس آؤ!!!
دلِ حزیں کی تڑپتی چیخوں کو سنتے جاؤ۔
اسے دعا دو، پیام دینا کہ ایک انساں تمہاری یادیں لگا کے سینے سے جل رہا ہے
اور اپنی تنہائیوں کی موجوں میں ایک ٹوٹا ہوا سفینہ بنا ہوا ہے
تم نغموں کے مسرتوں کے نشے میں اس کو نہ بھول جانا
وگرنہ جھونکو! ——— مرے دریچے کو بند کردو
جو رقص کناں ہیں حسیں پھواروں، لطیف نغموں، مسرتوں سے کہو یہ جا کر
ادھر نہ آئیں، ادھر نہ آئیں
مری نگاہیں [illegible] ساقی گیا ہے
ہوا کے جھونکو ——— مرے دریچے کو بند کردو
مرے دریچے کو بند کردو!!!

بلراج کومل

میرے نغمے تو روایات کے پابند نہیں

میرے نغمے تو روایات کے پابند نہیں
تو نے شاید یہی سمجھا تھا ندیم
تو نے سمجھا تھا کہ شبنم کی خنک تابی سے
میں ترا رنگ محل اور سجا ہی دوں گا
تو نے سمجھا تھا کہ پیپل کے گھنے سائے میں
اپنے کالج ہی کے رومان سناؤں گا تجھے
ایک رنگین سی تتلی کے پروں کے قصے
کچھ سحر کار نگاہوں کے بیاں
کچھ جواں سال اداؤں کے نشاں
کچھ کروں گا لب و رخسار کی باتیں تجھ سے
تو نے شاید یہی سمجھا تھا ندیم

•

تو نے یہ کیوں نہیں سمجھا کہ مرے افسانے
طنز بن کر تری سانسوں سے الجھ جائیں گے
زندگی چاند کی ٹھنڈک ہی نہیں
زندگی گرم مشینوں کا دھواں بھی ہے ندیم
اس دھوئیں میں مجھے زنجیر آتی ہے
مجھ کو خود تیری ہی تصویر نظر آتی ہے
غور سے دیکھ ذرا دیکھ تو لے
تجھ کو ڈر ہے ترا چہرہ نہ جھلس جائے کہیں
مجھ کو ڈر ہے تری تہذیب نہ جل جائے کہیں
مجھ کو ڈر ہے تری تاریخ نہ جل جائے کہیں
مجھ کو ڈر ہے یہ روایات نہ جل جائیں کہیں
پھر بھی اک دن اسی خاکستر سے
اک نئے عہد کی تعمیر تو ہو جائے گی
ایک انسان نیا ابھرے گا
صبح اور شام کی ملتی ہوئی سرحد کے قریب
اپنے چہرے پہ شفق زار کی سرخی لے کر
ایک انسان نیا ابھرے گا

•

میرے نغمے تو روایات کے پابند نہیں
میں روایات کی تخلیق کیا کرتا ہوں!

اختر پیامی

ایک سوال

مجھے محسوس ہوتا ہے یہ اکثر
مری آنکھیں تو ہیں موجود لیکن
وہ بینائی نہیں ان کو میسّر
اڑا کر دھجیاں جو تیرگی کی
زمین و آسماں کو جگمگا دے
اچانک کھلکھلا اٹھیں بہاریں

میں اکثر بیٹھے بیٹھے سوچتا ہوں
نہ جانے کونسی وہ مصلحت ہے
کہ میری زندگی جس کی بدولت
اندھیروں میں بھٹکتی پھر رہی ہے
اندھیرے میں جنم میں نے لیا تھا
اندھیرے ہی میں اتنی عمر گذری
اندھیرے ہی میں مر جاؤں گا شاید!
ضیائے مہر سے ناآشنا ہوں

چمکتے چاند تاروں کی خبر کیا
یہاں تو تیرگی ہی تیرگی ہے

میں کیا جانوں بہاروں کی حقیقت؟
مجھے رنگین نظاروں سے نسبت؟
کہ میں وہ گلشن بے رنگ و بو ہوں
بہاریں جس کی قسمت میں نہیں ہیں

اگر تو خالقِ حُسنِ جہاں ہے
اگر شمس و قمر کی نُور باری
چمک تاروں کی، پھولوں کا تبسم
بہاروں کا یہ نکھرا نکھرا جوبن
مظاہر ہیں ترے لطف و کرم کے
تو پھر دریائے بے پایانِ رحمت
مجھ سے ہی وا کشی ہے منجمد کیوں ——؟

جمیل ملک

شکستِ نغمہ

صبحِ امید کے آزردہ اُفق سے اے دوست
ایک موہوم سی پھوٹی ہے کرن وہ بھی اُداس
غنچہ و گل کے شگفتہ ہیں حسیں رنگ محل
اور خاموش ہے ہر نغمۂ ناہیدِ حیات
میں نے مغموم تمنا کو دلاسا دے کر
اُس کے ہر ہر نفسِ دل کو سنوارا تھا ابھی
اور اک دوسری جنت کی بنا ڈالی تھی
وہ بھی پژمُردہ ہے خاموش ہے ویراں ہے ندیم
شام کے سانولے چہرے کی شفق گوں سُرخی
رات کے تنگ [illegible] میں [illegible] ہی رہی
زہرۂ شوق کی [illegible] کی قطار
منتشر ہو گئی بکھرے ہوئے تاروں کی طرح
لالہ و گل [illegible] غنودہ سی ہے رو
آج دوشیزۂ بہار [illegible] ہے بہکا سا وقار
سبزۂ نو پہ رمیدہ نہیں آہوئے نظر
آج چشمے کے تموّج [illegible] بربط بھی خموش
روحِ احساس کے ہر تار سے پھوٹے ہیں شرر
میری تخئیل کے پھولوں میں نہیں موجِ شمیم
سرد ہونے لگے وارفتہ نگاہی کے چراغ
چھا گئی تیرگیٔ شامِ بلاخیز کی رو

قمر ہاشمی

زنداں

آنکھ کھولی تو مسلّط تھا اندھیروں کا غرور
کتنی ہی راتوں کی تاریکی سمٹ آئی تھی
ڈھونڈتی ڈھونڈتے کرنوں کو نگاہِ مجبور
بارہا پھر اسی مرکز پہ پلٹ آئی تھی
ایک سنّاٹا تھا ہر سمت محیطِ رقصاں
اک جہانگیر خموشی کی رجز خوانی تھی
میرے ہونٹوں میں تھی الجھی ہوئی مایوس فغاں
میرے دامن میں تڑپتی ہوئی حیرانی تھی
گاہے دل میں مرے کچھ شعلے بھڑک اُٹھتے تھے
گاہے گاہے کہیں سرگوشی کھنک جاتی تھی
گاہے گاہے کہیں دو اشک چمک اُٹھتے تھے
گاہے گاہے کوئی زنجیر چھنک جاتی تھی
یک بیک تیرہ فضاؤں میں چمک پیدا ہوئی
آسمانوں سے اُتر آئی اک آوارہ کرن
گنگ ماحول میں بھرپور چھنک پیدا ہوئی
چھنچھناہٹ میں کہیں کھو گئی زنداں کی گھٹن
اب بھی لیکن وہی تاریکیاں لہراتی ہیں
یہ سحر تاب کرن زیست کو گرما نہ سکی
اب بھی سانسیں ہیں کہ سینوں میں گھٹی جاتی ہیں
زندگانی کسی پہلو سے سکوں پا نہ سکی

خاطر غزنوی

گیت

بڑھتے چلو بڑھتے چلو
بڑھتے چلو طوفاں کے سہارے بڑھتے چلو!

آج اگر طوفان کی لہریں جوش پہ ہیں تو کیا ڈر ہے
چار طرف گر خون کی نہریں جوش پہ ہیں تو کیا ڈر ہے
تم بھی بنو طوفاں کے دھارے بڑھتے چلو
بڑھتے چلو طوفاں کے سہارے بڑھتے چلو

آج اگر پانی میں کنارے ڈوب گئے ہیں تو کیا غم
آج اگر ملاح بھی تھک کر ڈوب گئے ہیں تو کیا غم
خود ہی اُبھر آئیں گے کنارے بڑھتے چلو
بڑھتے چلو طوفاں کر سہارے بڑھتے چلو

دیش کی سونی دھرتی تم نے اپنے خون سے سینچی ہے
قوم کی مردہ رگوں میں تم نے تازہ زندگی بھر دی ہے
تم ہو بھارت ماں کے دلارے بڑھتے چلو
بڑھتے چلو طوفاں کے سہارے بڑھتے چلو

کب تک بھارت کے امبر پر دُکھ کے بادل چھائیں گے
کب تک بھارت کی دھرتی پر اندھیارے لہرائیں گے
دیکھو وہ اُبھرے سُرخ ستارے بڑھتے چلو
بڑھتے چلو طوفاں کے سہارے بڑھتے چلو

یزدانی جالندھری

قطعات

وہ بے نیاز تبسم، وہ باوقار حجاب
تری ہر ایک ادا پر نثار کون و مکاں
ترے جمالِ قبا آزما کا غازہ ہیں
فروغِ ماہِ درخشاں، غبارِ کاہکشاں

پازیب کی آہستہ چھما چھم کے تصدق
پھر وقت کی جھنکار بنے نغمۂ ہستی
اور شامِ ملاقات کی پُر کیف ہوائیں
لے آئیں پھر اِک عالمِ رعنائی و مستی

کوئی جوگن بال بکھرائے ہوئے
اپنی کٹیا کی طرف ہے تیز گام
آسماں سے چاند شرمائے ہوئے
دیکھتا ہے اُس کا حُسنِ لالہ فام

کسمساتے جسم کی یہ کیف آور لرزشیں
نوجوانی میں فلک کے لمس سے ڈرتی ہوئی
سرسراتے پیرہن سے گرم خوشبو کی لپٹ
میرے جذبِ شوق سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
یہ خرامِ ناز کی رعنائیاں، سرمستیاں
میرے دل کی بزم آرائی کا دم بھرتی ہوئی

کرشن موہن

حشرِ جذبات

ہجر میں تیری میں بے تاب و تواں اور سہی — یعنی غم میں مری ہستی کا زیاں اور سہی
گل ہے افسردہ، بہاروں سے چمن ہے محروم — ہے یہی رنگ تو اس کا تو خزاں اور سہی
محرمِ جلوۂ رنگیں، دلِ وارفتہ ہے — یہ تجلّی ہے تو وہ جلوہ کناں اور سہی
لب ہیں خشک، آنکھ ہے خونابہ فشاں، جیب میری — جذبۂ غم مری صورت سے عیاں اور سہی
رنگِ عشرت میں [illegible] ہو کے نہ ہوگا کوئی فرق — تیری محفل میں مری ایک فغاں اور سہی
اب [illegible] کی کوشش ہی فضول — جیب سے صورت سی عیاں اشک رواں اور سہی
آستاں [illegible] ہزاروں سجدے — مرے سجدے کا وہاں ایک نشاں اور سہی
یوں تو ہیں [illegible] کی طرف لیکن — اس محبت میں ترا وہم و گماں اور سہی
مری صورت سے مجھے [illegible] کچھ دشوار — میں نے مانا کہ محبت کی زباں اور سہی
یوں تو دلکش ہے ترے وعدۂ رنگیں کا فریب — دل کی تسکیں کے لیے حسنِ بیاں اور سہی

آشیاں جب سے ہے مرا برق کی زد میں ثاقب
نالۂ غم مرا اک شعلہ فشاں اور سہی

ثاقب کانپوری

دو غزلیں

وہ کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہو نہیں سکتی
حقیقت دیکھئے کب تک حقیقت ہو نہیں سکتی
نگاہِ مست کے ساغر وہ یوں تقسیم کرتے ہیں
کہ محفل میں کسی کو بھی شکایت ہو نہیں سکتی
اک [illegible] خصوصی سے [illegible] و طور کا قصہ!
اب آئندہ کسی کو ایسی جرأت ہو نہیں سکتی
ہمیں [illegible]
یہ [illegible] جرأت ہو نہیں سکتی
تمہارے نام سے پیار آ [illegible]
یہ کوئی اور کیفیت ہے غفلت ہو نہیں سکتی
محبت برتر و بالا ہے [illegible]
یہاں دنیا شریکِ رنج و راحت ہو نہیں سکتی

[illegible] بھوپالی

★

دل نے غموں کا شکوہ تو ہر چند کر دیا
لیکن انہیں بھی [illegible] کر دیا
تو ورنہ کائنات میں بے ننگ و نام تھا
میں ہوں کہ جس نے تجھ کو [illegible] کر دیا
احسان مند ہوں میں ترا اے غمِ حیات
تو نے کبھی کبھی مجھے خود [illegible] کر دیا
تیری نظر نے دولتِ کونین کے عوض
غم دے کے زندگی کو رضامند کر دیا
اک تیری آرزو کی حفاظت کے واسطے
ہر آرزو کو خاک کا پیوند کر دیا
[illegible] ستم ظریفیٔ فطرت کا کیا جواب
[illegible] جنوں کو [illegible] خردمند کر دیا
[illegible] مجھے کسی نے نہایت خلوص سے
آزاد کر کے اور بھی پابند کر دیا

[illegible] اکبرآبادی

★

دو غزلیں

★

وہ دے گئے مجھے پیغام یہ نگاہوں میں
خرد نے ٹھوکریں کھائی ہیں دل کی راہوں میں

سکوں ملے نہ ملے زندگی کی راہوں میں
گزار لیں کوئی دم آپ کی پناہوں میں

ہزار عقل نے کیں پاسبانیاں دل کی
بڑی کشش تھی مگر آپ کی نگاہوں میں

حضور بارِ وفا آپ سے نہ اٹھے گا
چلیں نہ آپ مرے ساتھ غم کی راہوں میں

ابھی تو منزلِ دل کا نشاں ہی پایا ہے
ابھی ٹھہر نہ کہیں زندگی کی راہوں میں

چھپا ہے رازِ محبت کہیں چھپائے سے
مری زباں پہ ہے اور آپ کی نگاہوں میں

کبھی جو درد سے مہلت ملی غریبوں کو
لپٹ کے سو گئے چپ چاپ غم کی باہوں میں

تمام عمر کٹی تشنہ کامیوں میں مگر
خرد نے ساتھ نہ چھوڑا جنوں کی راہوں میں

اختر سعید (علیگ)

★

جو فردِ عظمتِ انساں کے گیت گاتا ہے
حوادثات کی زد پر کنول جلاتا ہے

کوئی غریب جو شب کو گہر لٹاتا ہے
نگاہِ انجمِ تاباں میں ڈوب جاتا ہے

افق پہ ظلمتِ شب کی چتا سلگتی ہے
اٹھو کہ نورِ سحر اب جھلک دکھاتا ہے

تمام منظرِ ہستی بنا ہے عالمِ نور
پسِ حجاب کوئی شوخ مسکراتا ہے

ندیم باغِ جہاں کے فضا شناسوں کو
خزاں میں مژدۂ فصلِ بہار آتا ہے

تری نوا میں تو جابر ہے حشر کا انداز
کہ خوابِ ناز سے انسان چونک جاتا ہے

رفیق جابر

چاندی کا لڈّو

اُٹھان

نئی تصویریں

سیّاح

آبشار

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

عظیم انور رشیم

چاندی کا لڈو

تو میں یہاں کالج میں ایک معمولی کلرک ہوں۔
ہاں تو اس روز اگست کی چودہ تاریخ تھی۔ اور دوسرے دن آزادی کی پہلی شاندار سالگرہ منائی جانے والی تھی۔ اور میں کالج کے دفتر میں جھک مار رہا تھا، کاؤنٹر پر لڑکے بھانت بھانت کے آوازے کس رہے تھے۔ تنخواہیں کھنک رہی تھیں اور میں روپے گن گن کر بکس میں رکھتا جا رہا تھا۔ لوہے کے بکس میں۔ لوہے کے کالے مضبوط بکس میں۔ جواب ہمارے بند نہیں ہو رہا تھا۔ آخر کتنا روپیہ ہضم کرے۔ اور روپے تھے کہ پنجاب کے پناہ گزینوں کی طرح اس میں سمائے جا رہے تھے اور بکس کا پیٹ پھولتا جا رہا تھا۔ اور اس کا ڈھکن اُچک اُچک کر اوپر اُٹھتا جا رہا تھا۔ اس کا منھ اور کھلتا جا رہا تھا۔ لیکن کاؤنٹر پہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ——
"کیوں ایشوری بابو کھانا کھا کر نہیں آئے ہیں کیا؟"
اور میں پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔
"بھئی دِق مت کرو —— ایشوری بابو بہت نروس آدمی ہیں ——"
اور میں داڑھی کھجلانے لگا۔ کئی روز سے داڑھی نہیں بنی تھی، لیکن یہ بھی کوئی یہ سب سوچنے کا وقت تھا۔
"بالکل چغد ہیں ایشوری بابو —— ہاتھ کانپتے ہیں —— بھیا روپیہ لو اور رسید پھینکو —— چیکیوں کا کام قیامت ہے۔"
اور مرے، ہاتھ کا ارتعاش رک گیا۔ پسینے کی چبھن مٹ گئی۔ داڑھی کا احساس مر گیا، اور بس میں کلینڈر کی طرف دیکھنے لگا۔
چودہ اگست یعنی پندرہ اگست کا دیباچہ۔ یعنی پندرہ اگست کی ماں۔ یعنی آزادی کی سالگرہ۔ یعنی کل دیش کی آزادی کا پہلا سال پورا ہو جائیگا ——!
"حد کر دی ایشوری بابو نے —— کیوں نہیں پرنسپل سے کہا جائے —— ایشوری بابو کو آپ اپنے بچے کے لئے آیا رکھ لیجئے —— ہا ہا ہا —— ہا ہا ہا"
میں گھبرا گیا۔ معلوم ہوا کہ حلق میں سوکھی ہوئی گھانس کی گرہ پڑ گئی ہے۔ اور پھندے پھیلتے جا رہے ہیں۔ آنکھوں میں دھواں اُڑ رہا ہے۔ اور پسینے کی چبھن، سرسراہٹ، گدگدی —— داڑھی کا کھردرا پن —— پھر ہر چیز اکڑتی ہوئی، پرواز کرتی ہوئی، دھما دھم گرتی ہوئی معلوم ہوئی —— اُف، صبح سے روپے گن رہا ہوں اور سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا —— کہتے ہیں ہندوستان میں تعلیم صرف دس فیصدی انسان حاصل کرتے ہیں۔ دس فیصدی کی تنخواہ لینے میں دم نکل جاتا ہے، —— اور لیکن سو فیصدی —— ارے باپ رے باپ، ——
"ہاں ایشوری بابو —— ساڑھے سات روپے ——"
ایک غریب سی آواز آئی ——
میں نے اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ ایک مضمحل سا، کمزور زرد چہرہ کا منشی مسکرا رہا تھا۔ ہر مہینہ میں ایک بار وہ زرد چہرہ میری آنکھوں کے سامنے کنول کے پیلے پھول کی طرح مسکراتا تھا اور میں گردن جھکائے نہ رہ سکتا تھا۔ روپیہ دگو سکتا تھا، کنڈر نہ دیکھ سکتا تھا۔ گھڑی نہ گھور سکتا تھا —— اور میری دبی ہوئی، جھکی ہوئی، دکھی ہوئی گردن دھڑ سے مروڑ جاتی تھی۔

اور اس وقت بھی منوں بھاری درد اور ٹیس کا بوجھ ٹپک کر میری گردن اُٹھ گئی اور وہی، مضمحل کمزور، زرد چہرہ کاونٹر پہ پیلے کینل کے پھول کی طرح مسکرا رہا تھا ——

مجھے یاد نہیں آتا - میں بھی جواب میں مسکرایا تھا کہ نہیں، میری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی کہ نہیں، میرے گالوں پہ سرخی دوڑی کہ نہیں —— (کیا دوڑی ہوگی، —— سیاہ جھلسے ہوئے گال جن پر داڑھی کی جھاڑی پھیلی ہوئی ہو)!

"کیا کہوں ایشوری بابو - کتنی مشکلوں سے یہ ساڑھے سات روپے حاصل ہوئے ہیں - ٹیوشن کرتا ہوں، ایک جگہ کھانا ملتا ہے ایک جگہ پندرہ روپے، کتابیں خریدوں، اپنی ضرورتیں پوری کروں - کیا کروں - میری تنخواہ معاف اس لئے نہیں ہوتی - اس کہ کوئی بڑا آدمی یہاں مجھے نہیں پہچانتا —— آپ ہی کچھ کوشش کیجئے نا ——"

ل

"لیجئے رسید لیجئے —— ساڑھے سات روپے ——" اور میں کھانسنے لگا - اور وہ زرد، کمزور تھکا تھکا کینل کا پھول بھی کھانسنے لگا اور پھر وہ غائب ہوگیا - اور بہت سے مردہ ہنس پڑے اور میری گردن جھک گئی - میں آوازیں چہروں کی جھلک دیکھتا تھا دیکھتے دیکھتے مشق ہوگئی تھی -

"ایشوری بابو بہت گرمی ہے -"

"جی ہاں ہے تو ——" اور سینٹ کا ایک جھونکا خراماں میرے نتھنے میں ٹہل گیا -

"ایشوری بابو آپ آدمی ہیں کہ گول گھر ——"

"جی میں نہیں جانتا —— ساڑھے سات روپیہ فیس - فائن تیرہ روپے لائبریری کے ایتھلیٹک کے بارہ آنے —— اکیس روپیہ چار آنے - اور یہ لیجئے آٹھ روپیہ بارہ آنے واپس ——" اور سگرٹ کا ایک لمبا کش منہ سے پھلانگ کر میرے نتھنے میں ناچنے لگا -

"ایشوری بابو آپ نہایت —— معاف کیجئے آپ آدمی ہیں کہ کلرک ——"

"جی —— کلرک ——" اور میں چونک گیا - ایک زبردست قہقہہ پہاڑ کی طرح میرے دماغ میں جم گیا - اور میرے ہاتھوں میں تھرتھراہٹ جم گئی - رگوں میں خون جم گیا - آنکھوں کی روشنی جم گئی - سانسیں جم گئیں —— "آدمی ہیں یا کلرک"

"لیجئے —— چلئے اب کل —— دیکھئے بینک کا وقت ہوگیا"

"ہرا ہرا —— تھری چیرز فار ایشوری بابو ——"

اور میری گردن سیدھی ہوئی اور کرسی کے پچھلے روک پر ڈھلک گئی - پورا بدن سن سن کر رہا تھا - جیسے میں ہلکا تھا، بہت ہلکا - جیسے میں کاغذ کی ناؤ تھا - اور میں ندی کے بہاؤ میں بہا چلا جا رہا تھا - سن - سن —— ہلکا بہت ہلکا —— معلوم ہوتا تھا کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا - بس اسی طرح کرسی میں پڑا رہوں گا - ہمیشہ ہمیشہ - چاہے طوفان آجائے، زلزلہ آ جائے - لیکن میں کرسی پر اسی طرح ڈٹا رہوں گا -

پرنسپل کے کمرے میں گھنٹی چیخ پڑی - میں اس گھنٹی سے بہت ڈرتا تھا، خواہ مخواہ کو ڈرتا تھا - جیسے وہ گھنٹی مجھے زندہ کھا جائے گی اور میں چونک گیا اور معلوم ہوا کہ آندھی، زلزلہ، اور عمارت کے گر پڑنے سے زیادہ خطرناک وہ گھنٹی تھی - اس لئے کہ میں پھر بکس پر جھک گیا تھا - اور حساب درست کر رہا تھا - میرا سر دکھ رہا تھا - آنکھیں دکھ رہی تھیں، جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا - زندگی دکھ رہی تھی سب کچھ دکھ رہا تھا - پھر بھی میں روپے گن رہا تھا - صبح سے روپے گن رہا تھا - گنے جا رہا تھا، جیسے ان روپوں سے کبھی نجات نہیں ملے گی - مجھے یہ روپے بھوت معلوم ہوتے تھے، جو بڑے بڑے ناخنوں اور نیزے کی طرح نکلے نکلے دانتوں کو چمکاتے ہوئے، جبڑے کھسوٹنے جھپٹ رہے ہوں - میں حساب درست کرتا جا رہا تھا اور میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا - کہیں حساب میں گڑبڑ نہ ہو جائے -

اور گڑبڑ ہو گئی۔ بس میں چکر میں تھا۔ کیا کروں۔ کیا نہ کروں؟ روپے بینک میں جلنے والے تھے اور حساب گول تھا۔ پانچ روپے کی کمی میرے لئے پانچ لاکھ کی کمی تھی۔ اب کیا ہوگا؟

پرنسپل کی گھنٹی چیخی، اور ساتھ ہی میری روح چیخ پڑی۔ میں ہاتھوں کو پسار کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی چاندی کے پانچ روپے ان میں گن دیگا۔ اور پھر میں ڈرنے لگا، ایک نامعلوم سا خوف رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ پرنسپل کی عینک اڑتی ہوئی آئی اور آنکھوں پر بجلی کی طرح چمک گئی۔ پھر وہ گول گول، سرخ سرخ تیزابی آنکھیں اُمڈ پڑیں۔ عینک ناچنے لگی۔ آنکھیں ناچنے لگیں۔ وہ گول گول آنکھیں ــــ بندوق کی گولیوں کی طرح۔ سرخ سرخ، گہری گہری، خفا خفا، آنکھیں، ــــ اور میں بہتا چلا گیا۔

"بجور ــــ بینک کا وقت ہو گیا ہے۔ جلدی کیجئے ــ"

چپراسی کہہ رہا تھا۔ بجور ایک خوبصورت نام ہے۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ دیونندن مجھے بجور، کیوں کہتا ہے؟ وہ چپراسی ہے میں کلرک ہوں۔ اس کو تیس روپے ملتے ہیں اور مجھے پچیس روپیہ بارہ آنے۔ اس لئے میں بجور ہوں اور وہ چپراسی ہے۔ اُلّو ہے۔ گدھا ہے ــ اے بے ــ اور کبھی کبھی کمینہ بھی ہے۔ اور اسی لئے وہ مجھے بجور کہہ سکتا ہے۔ اسکے وہ یہ خوبصورت جوتا ــ گھی میں، مکھن میں تلا ہوا، بھیگا ہوا جوتا مار سکتا ہے۔

دیونندن چپ چاپ کھڑا رہا، جیسے غور کر رہا ہو، "یہ دفتری بابو کو اتنا پسینہ کیسے چلتا ہے۔ پانی بہت پیتے ہوں گے۔ پیشاب کرنے کی فرصت کہاں، پانی کو تو نکلنا چاہئے بدن سے۔ چلو پیشاب نہیں پسینہ بن گیا۔" دیونندن ایسی باتیں سوچا کرتا تھا۔ کئی بار وہ اس حماقت کا اظہار بھی کر چکا تھا۔

"دیونندن ــــ" میں نے اپنے جانتے بہت پیار سے کہا۔

"جی بجور ــــ"

"دیکھو بجور مت کہو۔ کتنی بار تمہیں منع کر چکا ہوں"

"جی بجور اب نہیں کہوں گا ــــ" میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"اچھا بتاؤ تمہارے پاس پانچ روپے ہیں ــــ؟"

وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔

"کیوں بولتے کیوں نہیں؟"

اور وہ سر جھکائے ہوئے اپنے چھوٹے سے کمرے کی طرف چلا گیا۔ کھڑکی سے اس کا چھوٹا کمرہ نظر آتا تھا۔ اور میں اسے دیکھ رہا تھا، اپنا سر کھجلاتا، مٹھیاں مروڑتا۔ ران سہلاتا وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں سوچنے لگا، دنیا میں کوئی بھی میرا ہمدرد نہیں ہے۔ دیونندن بھی نہیں۔ جو غریب ہے۔ جو ایک معمولی سے چھوٹے کمرے میں اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ آخر وہ چپ چاپ چلا کیوں گیا۔ مجھے اپنی ذلت کا شدید احساس ہو رہا تھا میں اور کسی سے روپیہ مانگ بھی نہیں سکتا تھا اور دوسرے کلرک جو فائلوں پر جھکے ہوئے، جو ٹائپ رائٹر چلا رہے تھے، جو سر کو پکڑے ہوئے تھے جو ضبط ہو رہے تھے۔ ان کے پاس روپے کہاں سے آئے۔ ان کی بھی وہی حالت تھی۔ رونا رو رہے ہیں۔ بیوی کی ساری نہیں ہے۔ بچے کی دوا نہیں ہے۔ کالشیم کا دام بہت ہے۔ مکھن بہت گراں ہے۔ دودھ میں پانی ملا رہتا ہے۔ چاول تین روپیہ سیر مل رہا ہے۔ مصیبت ہی مصیبت، رونا ہی رونا، اذیت ہی اذیت۔ کٹھن ہی کٹھن ــــ اور پانچ روپیہ کا چرکا۔ یہ ظلم۔ یہ ستم۔ اور کالج کا کام سر پر پڑا تھا۔ میں ہی سب سے جونیر کلرک تھا اور پندرہ اگست کی تقریب میں کالج کو دلہن بنانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ یہاں ایک وبال تھا۔ پانچ روپے غائب ہوجانیکا مطلب میری تباہی کھلی ہوئی ــــ

بے بلوی تھی۔ اب کوئی امید نہیں تھی۔ پرنسپل کی آنکھیں، گول گول، سرخ سرخ، تیزاب اُگلتی ہوئی آنکھیں۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ بار بار کلنڈر پر نظر جاتی تھی اور ۱۴ اگست کا ڈھیلا آنکھوں سے ٹکرا جاتا تھا۔ جیسے جھولا جھولتے جھولتے کوئی زور سے پینگ بڑھا کے دیوار سے ٹکرا جائے ــــــــــــ

میں نے کھڑکی کی طرف نظر اٹھا دی۔ میلا سا ٹاٹ کا پردہ اٹھا اور دیوتندن کا کالا جسم بھاری سفید وردی میں جھولتا ہوا، آفس کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے پیچھے اس کی بیوی کا چہرہ جھلکنے لگا۔ گورا چہرہ، چپٹی ناک۔ وہ دور سے یہ سب پتہ نہ چلتا تھا۔ لیکن میں نے اسے قریب سے بھی دیکھا تھا۔ اور میں اسی شش و پنج میں کبھی اس کی چپٹی ناک کو دیکھ رہا تھا اور اس کا چہرہ پیتل کی تھالی کی طرح زرد تھا۔ اس کا چہرہ گورا نہیں تھا اور وہ اپنی آنکھیں آنچل سے پونچھ رہی تھی۔ جیسے آنسو خشک کر رہی ہو۔ دیوتندن سسکتا ہوا آفس میں آیا اور پانچ روپے کی ریزگاری گننے لگا اور میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔ میں حیرت میں تھا جیسے وہ روپیہ لیکر نہیں آیا تھا اگر روپیہ لیکر آیا تھا تو معجزے کی بات تھی۔ جیسے کسی ملحد کے سامنے پتھر کے بت بولنے لگیں اور وہ ریزگاری گن رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور ان میں سے کوئی گیت نکل رہا تھا۔ کوئی سُر پھوٹ رہا تھا۔ ریزگاری میز پر نہیں بج رہی تھی بلکہ اس کے ہونٹوں کا ترنم فضا میں گھل رہا تھا۔ اور وہ بینک چلا گیا اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔ لیکن اس کا فائدہ بھی کیا تھا۔ جاہل، بدتمیز، گنوار، شکریہ کا مطلب کیا سمجھ سکتا تھا۔ میں آفس سے نکل کر پرنسپل کے کمرے میں گیا۔ پندرہ ۱۵ اگست کا جلسہ زیر بحث تھا۔

"دیکھئے ایشوری بابو، ہر چیز آپ پر ہے۔ اگر آپ نے گڑبڑ نہیں کی تو ہمارا جلسہ شاندار ہوگا۔ باہر سے لوگ آ رہے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ۔ ان کی پارٹی بڑے ہال میں دیجائیگی۔ ریفرشمنٹ پیلس میں بہترین ہوگا۔ وہیں سے بات چیت کیجئے۔ اور جائیے جلدی کیجئے۔ اور پھول پتیوں کا انتظام ٹھیک کر دیجئے ــــ"

پانچ روپے کا سامان ہو گیا تھا۔ میں خوش تھا اور پھول پتیوں کے ذخیرے میں مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ آزادی کی عزت میرے سینے میں دھڑک رہی تھی۔ واقعی آزادی بھی بڑی نعمت ہے۔ بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ میں سوچتا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ہی اور لڑکے بھی پھول پتیوں میں لگے ہوئے تھے۔ وہ فلمی گانے گا رہے تھے۔ سگریٹ اڑا رہے تھے، مونگ پھلی کھا رہے تھے اور کاغذ کے پھول تراش رہے تھے۔ دیوار پر پھیلے ہوئے ترنگے نقشے کو مالاؤں اور چمکیلے طبق کے پھولوں سے سجا رہے تھے۔

اور وہی زرد کمزور مضمحل چہرہ سسک رہا تھا۔ کنیل کے پھول کی طرح۔ جیسے وہ ان کاغذی رنگین پھولوں پر خندہ زن ہو، اُن کا مذاق اڑا رہا ہو، انھیں جھٹلاتا ہو ــــ میں زرد ہوں، کھلایا ہوا ہوں، بیمار ہوں، کمزور ہوں۔ لیکن حقیقت ہوں، سچائی ہوں۔ میری رگوں میں زندگی ہے ــــ اور تم، اور تم ــــ کاغذ کے پھول ہو، سرخ رو ہو۔ لیکن جھوٹے ہو، فریب کار ہو تم اصل نہیں ہو سکتے ــــ میں زرد ہوں، لیکن زندگی کا پرتو ہوں ــ اور تم ــــ اور تم ــــ

اور میں جھنجھلا گیا ــــــــــــ

رات کے دس بجے فرصت ہوئی۔ آنکھیں اینٹھ رہی تھیں۔ حلق سوکھ رہا تھا۔ دیوتندن نے دری، میلا، گندہ، میلا ٹاٹ اٹھایا اور مٹی کے گھڑے میں پانی ملایا۔ اور میں نے پھر اس کا شکریہ نہیں ادا کیا۔ اس لئے کہ بھینس کے آگے کون بین بجائے جو حضور کو جھک بنا دیتا ہو، گلی میں، مکتب میں ــ بھلا وہ شکریہ کا مطلب کیا سمجھ سکتا ہے۔ اس کے لئے ادب سے نہیں ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایشوری بابو ہونے کی ضرورت ہے جو کلرک اور آدمی کی تمیز کر سکے، جو کلرکی کو آدمیت پر ترجیح دے سکے۔ اور بھلا دیوتندن کیا جانے آدمیت اور کلرکی ــــــــــــ

میرا محلہ کافی دور تھا۔ راستہ بھر کتے بھونکتے رہے۔ وہ گلہ گلی میدان کے پاس [illegible] [illegible] [illegible] وہاں مزدور رہتے ہوتے تھے۔ صبح ہی صبح ہم پہ کشتی [illegible] ہونے والی تھی۔ [illegible] [illegible] کی طرف [illegible]

جو نزدیک ہونے کے باوجود بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ تیل کی کمی سے روشنیاں بہت کم ہوگئی تھیں۔ دکانیں سویرے ہی کھل جاتی تھیں۔ الکٹرک سپلائی بند تھی۔ میں ـــ ذکر کیا۔ کتوں کی وحشت بڑھ گئی تھی اور میں ڈرتے گھوم کر گاندھی میدان کی طرف دیکھنے لگا، جہاں رونق تھی، جہاں مزدور کام کر رہے تھے۔ جہاں منھ اندھیرے پرچم کشائی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ لوگ پاگلوں کی طرح خوشیاں منائیں۔ مگر ایسی بات نہ تھی۔ ایک سال گذر گیا تھا۔ آزادی کا ایک سال گذر گیا تھا۔ آزادی کو ایک سال گویا وہ ایک سال نہیں تھا، وہ وقت کا تاج محل تھا اور وہ چاند اور ستاروں کی طرح جگمگا رہا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک تھکی تھکی افسردگی کیوں تھی۔ میں نے جب اپنے آپ کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ وہی افسردگی ایک تاریک سوتے کی طرح میرے سینے میں بھی رس رہی ہے ـــ مجھے اپنے پر غصہ آنے لگا، اپنے آپ پر، اپنے محلّے پر، مزدوروں پر جو ایک خوفناک خاموشی کے ساتھ کام میں منہمک تھے۔ دوکانوں پر جو چراغاں کرنے کے بجائے بجھی بجھی تاریکیوں میں ڈوب گئی تھیں۔ آخر آزادی کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے۔ حکومت کوئی دباؤ بھی نہیں ڈالتی۔ وفاداری کے لئے دباؤ ڈالتی ہے زمینداری کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے دباؤ ڈالتی ہے، کم تنخواہوں پر تیار ہونے کے لئے دباؤ ڈالتی ہے۔ کشمیر کے محاذ پر جانفروشی کے لئے دباؤ ڈالتی ہے، لیکن یہ کیا کہ آزادی کی سالگرہ منانے کے موقع پر عوام اس بُری طرح ٹھنڈک اور سرد مہری سے کام لیں، اور حکومت چپ بیٹھی رہے۔ نہایت نااہل حکومت ہے ہماری بھی۔ جو حکومت بڑی بڑی مزدوروں کی پارٹیوں کو غیر قانونی قرار دے سکتی ہے کیا اس میں یہ طاقت نہیں کہ ایسے لوگوں کو پھانسی پر چڑھا دے جو آزادی کے ایک سال کا تاج محل نہ تعمیر کریں، چراغاں نہ کریں۔ قہقہے نہ لگائیں، جلوس نہ بنائیں۔ دعوتیں نہ کھائیں کھلائیں۔ جگمگ جگمگ ـــ زندگی کو جگمگا نہ دیں، تاباں تاباں۔ جولاں جولاں ـــ وہ تو نوازش ہے، احسان ہے قوم پر ان چند لوگوں کا کہ اس موقع پر روپیہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ دعوتیں کر رہے ہیں۔ مرغیاں اور انڈے خرید رہے ہیں۔ گھروں کو پھولوں سے مہکا رہے ہیں۔ آتش بازیاں بنوا رہے ہیں۔ اچھی اچھی شراب ڈھونڈ رہے ہیں وسکی۔ برانڈی، جن ـــ اچھی کوالیٹی کی اچھی کمپنی کی ـــ ٹھیک ہے ان منحوسوں کو دعوت مت دو۔ منھ لٹکائے، چہرے پر بارہ بجائے، جھکے جھکے، گرتے گرتے، چلیں گے۔ جیسے سالگرہ نہیں آرہی ہے سوتیلی ماں آرہی ہے ـــ واقعی ان چند گنے چنے لوگوں نے قوم کی لاج رکھ لی ورنہ دنیا والے یہ دیکھ کر کیا کہتے کہ ـــ ہندوستان والے آزادی کی قیمت ہی نہیں جانتے۔ وحشی ہیں وحشی!۔

میں اپنے گھٹے ہوئے تنگ و تاریک ماحول میں پہونچ چکا تھا۔ میں نے بغل والے کمرے کی طرف جھانک کر دیکھا، بالکل اندھیرا تھا چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا سلامت تھا۔ اور کون ہو سکتا تھا۔ میں اس کے پاس گیا ـــ

"سلامت میاں ـــ"

"جی ـــ"

"سو گئے ـــ کنجی دو نا"

اس نے کمرے کی کنجی نکال کر دی۔ میں نے اپنا کمرہ کھولا۔ خوفناک اندھیرا تھا۔ ہر چیز بھیگی بھیگی، پاؤں کے نیچے، کنپٹیوں کے نیچے۔ آنکھوں کے پپوٹوں کے نیچے، سرسراتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کھڑکی پر موم بتی اور ماچس کی ڈبیہ ٹٹولنے لگا۔ موم بتی تو ملی لیکن کم بخت ماچس غائب تھی۔ ہاتھ ہی نہ لگی۔ نہ جانے چوہوں نے اسے کیک سمجھ کر ٹہلا دیا ہو۔ شاید انھیں بھی پندرہ اگست میں جشن کی سوجھی ہو۔ آخر ہیں ہندوستانی چوہے ـــ اور میں پھر سلامت میاں کے پاس پہونچ گیا۔

"ذرا ماچس دو سلامت میاں ـــ"

"زینب ـــ زینب ـــ یہیں ہوگی کہیں گئی ہوگی ـــ اچھا ٹھہرو"

وہ خود اُٹھا اور ماچس کی ڈبیہ اُٹھا کر لے آیا۔ میں نے موم بتی جلائی اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اپنے ہاتھوں سے موم بتی کی لو سے چاروں طرف ایک دیوار بناتے ہوئے ——— "ہوں ۔ بڈھا مجھے بدحواس سمجھتا ہے۔ کہیں گئی ہوگی۔ زینب کو کون نہیں جانتا۔ رات بھر اڑتی پھرتی ہے۔ لوگ جھوٹ نہیں بدنام کرتے۔ اور وہ ایسا کرتی کیوں ہے۔ آخر اس کا باپ تو بیسیوں پندرہ روز میں پندرہ بیس روپے کما لیں کم ہے کیا؟

ایک جاہل آدمی کے لئے جو بالکل بوڑھا ہو چکا ہو، جو ایک بیٹی رکھتا ہو، جو ایک نانی رکھتا ہے، چھوٹا سا جو ابھی ماں ہی کا دودھ پی رہا ہو، بھلا اس کے لئے اتنے روپے کافی نہیں ہوتے ہیں کیا۔ اس حساب سے تو وہ مجھ سے اچھا ہے۔ میں ایم اے فیل ہوں۔ توانا ہوں، تندرست ہوں، ہنس مکھ ہوں، ایماندار ہوں ——— پھر بھی پچپن روپے بارہ آنے تیس دن میں ملتے ہیں۔ تیس دن میں ——— لیکن میری بیوی تو بڑی باوفا ہے۔ میکے میں رہتی ہے، کبھی ایک پیسہ نہیں مانگتی۔ شادی کو ایک سال ہوگیا لیکن اس نے کوئی فرمائش نہ کی۔ یہ زینب ہے ہی بری۔

جب میں قمیص اتارنے لگا تو پسینے کی کھٹی کھٹی بو میرے نتھنے میں سڑے ہوئے چوہے کی طرح اٹکنے لگی۔ میں بدحواس ہو گیا حالانکہ میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔ پھر بھی یہ بدحواسی کیوں پیدا ہو جاتی ہے، ٹھیک قمیص اتارتے وقت دم گھٹنے لگتا ہے اور میں سانس روکنے کی ورزش کر لیتا ہوں اور سوچتا ہوں صبح اٹھوں گا تو میرا سینہ ۳۸ فٹ ہو جائیگا ——— مگر دست تو ۳۲ فٹ پر کام چل رہا ہے ———

کپڑے کی جھپٹ سے ہوا بو کو سنبھالنے لگتی اور میں چونک گیا۔ جب میں پلنگ پر لیٹنے لگا تو زینب پر پھر غصہ آگیا۔ جب تک وہ نہیں آتی کھانا نہیں مل سکتا۔ کم از کم سالگرہ کے احترام میں تو اس ایک رات گناہ سے بچنا چاہئے تھا۔ مگر لاابالی کی حد ہو گئی، وہ آئیگی نہیں۔ انتڑیوں سے کہیں کئے جاؤ۔ نیند کا میلوں سراغ نہ ملتا تھا۔

دروازے کے پاس ایک لفافہ جھلکنے لگا۔ میں نے اچھل کر اسے اٹھا لیا اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔

شاردا نے لکھا تھا "آپ نہیں آئے۔ کالج بھی آپ کا بند تھا۔ شادی کو ایک سال ہو گیا۔ اور اب آپ جانتے ہیں اب ہم بھگوان کی دیا سے دو سے تین ہونے والے ہیں، لیکن میرا دل ڈرتا ہے، جانے کیا ہو، ابھی میری پھوپھی کی لڑکی اسی میں مر چکی ہے، بچہ بھی نہ بچا۔ میں شہر آنا چاہتی ہوں۔ وقت کم ہے۔ آگے چل کر موٹر کی سواری نقصان کریگی ——— میں ابھی سے آپ کی راہ دیکھوں گی ——— "

اور میری آنکھوں کے سامنے گرینڈ ٹرنک روڈ ایک سیاہ کپڑے کے تھان کی طرح کھلتا چلا گیا اور چلتے چلتے اندھیرے میں گھر گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ سانسیں اکھڑنے لگیں۔ میں دیر تک خط کو گھورتا رہا اور میری بیوی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نازک نازک لفظ سانپ اور بچھو معلوم ہونے لگے۔ ابھی سے راہ دیکھونگی۔ کتنی بڑی بیوقوفی ہے۔ ارے بھائی کہاں سے لے آؤں تمہیں مشکل سے گذر ہوتا ہے، قرض کا سلسلہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اگر زینب بیچاری کھانا نہ پکا دیتی اور میں اپنے ہندو پن کا گلا نہ دبا دیتا چھوت چھات کی لاش پر کھڑا نہ ہو جاتا تو ہوٹل سے کام بھی نہ چل سکتا تھا اور تمہیں شہر میں لا کر رکھوں۔ مکان لوں۔ نئے لاؤں مہینہ بھر کے لئے اسپتال کا علاج کراؤں۔ کیوں فضول ایسی باتیں کہتی ہو جو میرے بس کی نہیں۔ میں الٹا بھی لٹکا دیا جاؤں تو یہ سب کچھ نہیں کر سکتا کہاں سے کر سکتا ہوں۔ دیکھو نا کل آزادی کی سالگرہ ہے اور میرے پاس ایک صاف دھوتی اور قمیص بھی نہیں جو پہن کر نکلوں۔ میری شاردا تمہیں یہ سب کچھ نہ لکھنا تھا۔ یہ سب سپنے کی باتیں ہیں۔ کسی نے تمہیں بہکایا ہوگا۔ کسی سہیلی سے بازی لگی ہوگی۔ اس نے اپنے شوہر کے گن گائے ہوں گے اور تم نے بھی اپنی شکست پسند نہ کی ہوگی۔ تم نے بھی میرے گن گائے ہونگے۔ تمہاری آنکھیں پھیل گئی ہونگی۔ لب چمکے ہوں گے۔ گردن ہلی ہوگی اور تم نے غرور سے بازی لگائی ہوگی

کہ میں تمہیں اپنی جان تک دے سکتا ہوں، تمہیں شہر لے جا سکتا ہوں۔ سب بال بچے علاج کروا سکتا ہوں۔ زمین خرید سکتا ہوں بچے کے گہنے اور گاڑیاں خرید سکتا ہوں، لیکن تم نے اپنی سہیلی کی باتوں کا اعتبار کر لیا، وہ بالکل جھوٹ بولی۔ اس کا شوہر بھی میری طرح اپنے مذہبی عقائد کا خون کر کے اپنا پیٹ بھر رہا ہوگا۔ اس کے قریب بھی بہت سی زینبیں رہتی ہونگی۔ اس کے نزدیک بھی کوئی سلامت ہوگا، اور وہ بھی اپنے کمرے میں موم بتی جلاتا ہوگا اور وہ بھی اپنے بغل کے کمرے سے ماچس کی ڈبیہ بھیک مانگ کر لاتا ہوگا ——— اور ——— اور ———

دور سے کچھ اعلان کرنے والی آواز سنائی دی ——— "کل تڑکے گاندھی میدان میں آزادی کا ترنگا جھنڈا لہرایا جائیگا۔ فوج سلامی دیگی۔ آپ لوگ لاکھوں کی تعداد میں، لاکھوں کی سنکھیا میں ———"

میرے پاس قمیص بھی نہیں، دھوتی بھی نہیں۔ آخر کیسے نکلوں گا، وہی پسینہ والی قمیص کو پہن کر نکلنا اصل ترنگے کو گالی دینا ہے۔ اور میں ایسی غداری اور کمینی بات کر ہی نہ سکتا تھا۔ میں ایک وفادار غلام ہوں۔ اور ہر شخص کو ہونا چاہئے۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ اس کے بغیر کوئی حکومت حکومت نہ چلا سکیگی جس روز غلام وفاداری سے اکتا جائیں گے اُس روز حکومت کی ارتھی نکل جائیگی۔ اور میں حکومت کی ارتھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ حکومت حکومت ہے ——— لیکن دھوتی اور قمیص کا سوال چیختا چلا جا رہا تھا۔

آہستہ آہستہ بھڑک واپس لوٹ آئی۔ میں کمرے سے باہر نکلا

"کیوں سلامت میاں زینب آئی واپس"

"نہیں آئی ——— کھوں کھوں" وہ کھانسنے لگا۔

"کیوں نہیں آئی" میں نے خود ہی سوال کیا۔ کیا بے تکی بات ہے۔ کیا آزادی کی سالگرہ کا یہ مطلب ہے کہ عورت گھر باہر ہے اور سلامت میاں بھی بھیگی بلی کی طرح خاموش رہنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کی زبان چلتی تھی تو طوفان میل کی طرح لیکن جیسے وہ ٹیاتا چاہتا تھا۔

شروع شروع میں جب اس کمرے میں آیا تھا۔ اسی زمانے میں میری شادی ہوئی تھی اور میری نوکری کو صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ اس زمانے میں میں ایک نزدیک ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ ہوٹل کا کھانا بالکل بیچارہ تھا، پر کھاتا تھا اور کرتا بھی کیا۔ دام بھی بہت لگ جاتے، پیٹ میں خلش رہ ہی جاتی۔ عجیب مشکل تھی۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ سلامت مزدوری پر سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں بچاٹے کا سامان تھا۔ اور اس کی داڑھی کے اوپر آنکھوں کے پاس چونے کی چھینٹیں سوکھ گئی تھیں، وہ بہت تھکا تھکا معلوم ہو رہا تھا۔

زینب نے اس کو پانی لا کر دیا۔ اس نے منہ دھویا۔ پھر کمرے میں جا کر کچھ کھایا۔ ایک ہولناک ڈکار لی اور باہر آ کر میرے کمرے کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور بیڑی کا دھواں اچھال اچھال کر مجھے گھورنے لگا۔ اس کی مونچھوں میں دھواں پھنس جاتا تھا اور رہ رہ کر اس میں سے دھوئیں کے ننھے ننھے بیلے اڑنے لگتے تھے۔

میں بھی وہیں پر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں گرمی بہت تھی۔ بادل کے گھرنے سے تاریکی تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔ سامنے دوکان پر نون تیل کا شور بڑھتا جا رہا تھا ——— کہ وہ اچانک مجھ سے پوچھ بیٹھا "آپ کہاں کام کرتے ہیں بابو جی" ——— "میں کالج میں کام کرتا ہوں ———"

"آپ بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں ———" اور میں کھسیانہ سا ہو کر رہ گیا۔ پھر اس نے شادی کی باتیں پوچھ ڈالیں تنخواہ کی باتیں، عمر اور شہر کی باتیں، تعلیم کی باتیں اور ہوٹل کی زیادتی کی باتیں ——— اور جلد ہی اس سے

بے تکلفی ہوگئی اور ایک ہفتہ کے بعد زینب میرا کھانا پکانے لگی اور لوگوں کو میری مذہب فروشی پر غصہ آنے لگا۔

وہ روز صبح سویرے ہی بسولا۔ کٹھوٹ اور پچاوا لیکر نکل جاتا۔ وہ پرانا راج تھا۔ اس کے بنائے ہوئے بہت سے مکانات شہر میں جگمگا رہے تھے۔ اور وہ اپنی ایک سے ایک کہانی سناتا۔ انجنیر کو پکڑوا دینے کی کہانی۔ ایک مزدور عورت سے محبت کی کہانی زینب کی شادی کی کہانی۔ شوہر سے لڑائی اور علیحدگی کی کہانی ——— محلہ والوں کی بدتمیزیوں کی کہانی۔ اپنی شرافت اور زینب کی فرشتہ زندگی کی کہانی ——— مستقل بکتا رہتا۔ میں ہوں ہاں کرتا رہتا۔ وہ بیڑی پیتا رہتا۔ دھواں اگلتا رہتا، کھانستا رہتا، ران بجاتا رہتا۔ مسکراتا اور داڑھی کے جنگل کے درمیان میلے میلے دانتوں کا مظاہرہ ہوجاتا۔ زور سے قہقہہ نہ لگاتا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں ایسی گھن گرج تھی کہ بڑے بڑے قہقہوں میں نہ ہو ———

وہ بہت باتونی تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔ مجھے اس پر بھروسہ تھا۔ لیکن وہ زینب کے معاملہ میں مجھے فریب دیتا تھا۔ اور یہی ایک شکایت مجھے اس سے تھی۔

اور اب دوسری شکایت یہ پیدا ہو رہی تھی کہ وہ جان بوجھ کر سوتا بن رہا تھا اور اپنی بیٹی کی پارسائی جتا رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ کہاں گئی تھی۔ وہ ہر رات اسی طرح نکل جاتی تھی۔ سیٹی کی آواز آتی تھی اور وہ بستر سے اٹھ کر نکل جاتی تھی اور اس وقت سلامت کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔ گلی میں سناٹا رہتا تھا۔ ہر طرف موت چھا جاتی تھی اور میں دیر تک جاگتا رہتا تھا۔ آنکھوں میں طرح طرح کے سائے جھومتے رہتے تھے۔ اور جب زینب واپس آتی تھی سلامت جاگ پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانستا تھا۔ کروٹ بدلتا تھا۔ اور چپکے سے اٹھ کر کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اور کچھ کمرے میں کھونستا ہوا پلنگ پر لیٹ رہتا تھا اور صبح اٹھ کر جب اس سے باتیں ہوتیں تو اپنی مونچھوں کی باتیں کرتا ———

"کیا تم جانو ——— میرا داماد بہت حرامی ہے۔ وہ دبانا چاہتا ہے۔ مگر میں دبیل نہیں ہوں۔ میری مونچھ اونچی رہی ہے اونچی رہیگی" اور منشی غنی کے اونچے مکان کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ جس پر اس نے زرد زرد پچارا مارا تھا۔

لیکن اس وقت میں اس سے بہت ناراض تھا۔ سوتا بن رہا تھا جھوٹ موٹ کو، کمینہ کہیں کا۔ بھوک سے دیوانہ ہے۔ اور نواب صاحب کھانستے بھی ہیں۔ آج زینب کو میں ڈانٹ دوں گا۔ ضرور ٹوک دوں گا۔ آخر یہ چھل کپٹ کتنی بری چیز ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔ پانی پڑنے لگا تھا۔ رکشا والے گھنٹیاں ٹھنٹھناتے ہوئے بھاگ رہے تھے اور میں بھوک سے دور ہونے لگا تھا۔ اندھیرا بھنور بن کر ناچنے لگا تھا۔ موم بتی بجھ گئی تھی۔ ایک سمندر اُٹھ رہا تھا اور ایک سمندر دھنس رہا تھا۔ اور اس سمندر میں ایک کاغذ کا ٹکڑا بہتا جا رہا تھا۔ لیکن بھیگنے سے کیا واسطہ۔ ایک ایک لفظ بڑے بڑے درخت کی طرح پھیل گیا تھا۔ "مجھے شہر لے چلو، مجھے شہر لے چلو"

ایک سانولا سا چہرہ ان درخت جیسے الفاظ کا جال چیر کر اُبھر آیا۔ سانولا سانولا، کانپتا کانپتا، لرزتا لرزتا، سبک سبک چہرہ، تھر تھراتے ہوئے لب، تڑپتے ہوئے لب، ننھا سا تل، پھولی پھولی سی رگیں۔ بھیگے بھیگے بھاری بھاری پپوٹے، پتلا دبلا جسم، چھوٹے چھوٹے بال اور ان کے جھرمٹ سے اٹھتی ہوئی تل کے تیل کی خوشبو۔

اور میرے دونوں بازو پھیل گئے اور ہر چیز اندھیرے میں غرق ہوگئی۔ صرف میرے بازو پھیلے رہے۔ اور وہ لرزا لرزا پتلا دبلا جسم سمندر کی اندھیری موجوں سے ابھرتا رہا ——— اور اس کے تڑپتے ہوئے لب اور تڑپتے رہے "شہر لیچلو شہر لے چلو، زندگی خطرے میں ہے۔ ہم دو سے تین ہونے والے ہیں، میری پھوپی کی لڑکی مر چکی ہے ——— کیا تم کیا تم ——— شہر لے چلو شہر لے چلو" اور میرے بازو پھیلتے چلے گئے، پورے آفاق کو سمیٹ لینے کے لئے، لیکن وہ جسم گرفت میں نہ آسکا۔ قاتل، سلامت، زینب اور بجھی ہوئی موم بتی ——— سب گرفت میں تھے، لیکن وہ لرزا لرزا، بجھا بجھا

دبلا پتلا جسم بہت پھیل گیا تھا، اور میرے بازو تھک کر گر گئے اور پھر اندھیرا مسلط ہوگیا۔ ایک گھڑگھڑاتا ہوا سمندر۔

اور جب میں صبح اٹھا تو کوئی خاص بات نہ تھی، مجھے بہت تعجب ہوا۔ پورا محلہ خاموش تھا۔ روزمرہ کی طرح زندگی بھنبھنا رہی تھی اور رتی کے مکان پر اونچا سا، بڑا سا جھنڈا نہ تھا، میں نے دو تین بار آنکھیں میچیں اور پھر غور سے دیکھا تو چھوٹے چھوٹے، نیچے نیچے، کمینے، ذلیل مکانوں کے آگے تین بڑے بڑے مکانوں پر جن میں سے ایک شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر، ایک سب سے بڑے ٹھیکیدار، اور ایک سب سے بڑے وکیل کا مکان تھا۔

تین بڑے بڑے کھادی کے ترنگے جھنڈے ہوا میں تڑپ رہے تھے، میں سوچ میں پڑ گیا۔ قمیص کہاں سے لاؤں، دھوتی کہاں سے لاؤں، داڑھی کیسے بنواؤں، بلیڈ موجود نہیں اور پھر مجھے خوشی کی ایک لہر نے آلیا۔ آزادی اپنی ملکیت ہے۔ کپڑے نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ میں خوش تو ہوسکتا ہوں اور میرا دل ان تین بڑے بڑے ترنگے جھنڈوں کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ خوشی سے ترنگ سے، زندگی، اور نغمے، گیت، شعر اور لے روح میں ناچنے لگے، گھلنے لگے اور آنکھوں میں آفتاب ہمک ہمک آئے۔ ناک میں پھولوں کی خمار آگیں خوشبو پرواز کرنے لگی اور میں سب کچھ بھول گیا۔ شاردا کا خط قمیص کی جیب میں تھا، لیکن میں اس کے اثر کو بھول چکا تھا۔ کپڑے گندے تھے، لیکن مجھے ان کی پروا نہ تھی۔ داڑھی انگلیوں میں چبھ رہی تھی، لیکن جہنم میں داڑھی۔ یہ بھی کوئی ٹیک ہوئی۔ البتہ کبھی کبھی میں اوپر والی جیب میں شاردا کا خط ٹٹول لیتا تھا، جیسے وہ ایک مہینے کی تنخواہ ہو اور غیر شعوری طور پر اس کے اڑ جانے کا خطرہ چونکا دیتا ہو۔

سفید پوش ٹوپی کو ہر ہر زاویئے سے ٹھیک طرح سر پر چپکائے گاندھی میدان کی طرف چلے جارہے تھے اور کاٹن مل کے مزدور اپنی میلی کچیلی دھوتیوں، میلی ڈھیلی مسکراہٹوں، پان کی پیکوں، بیڑی کے دھوؤں، تیل کے داغوں سے اٹی ہوئی قمیصوں کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر جارہے تھے، جیسے انھیں سالگرہ کی خبر ہی نہ تھی، جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ اتنی بڑی بات اور یہ بے نیازی۔ مجھے ان کی جہالت پر غصہ آگیا۔ واقعی ہندوستان کو وقت سے پہلے آزادی مل گئی تھی۔

گاندھی میدان میں چاروں طرف رسی سے ایک احاطہ بنایا گیا تھا۔ ایک طرف حکام شہر تھے۔ زرق برق لباس میں۔ زرق برق قہقہوں میں ڈوبے ہوئے، ہانپتے ہوئے، توندیں اچھالتے ہوئے اور درمیان میں صوبائی فوج کے دستے دیوار کی طرح کھڑے تھے ان کی رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں سنگینیں آسمان کی طرف کرن چھینکتی ہوئی کچھ تاک رہی تھیں۔

لیکن اسکول کی لڑکیاں اور استانیاں بسنتی ساڑیوں میں الگ الگ قطار بنائے کھڑی تھیں، بسنتی پریاں قطار اندر قطار کھڑی تھیں اور وہ چہک رہی تھیں، ان کی کمر سے سرخ سرخ رومال لٹک رہے تھے اور کنجیوں کا گچھا اور چاندی کا پان چمک رہا تھا اور ان کے ہونٹ چمک رہے تھے، ساٹن کے بلاؤز چمک رہے تھے۔ بڑا اہتمام تھا۔ آزادی کا رعب مکمل طور پر مجھ پر حاوی ہوگیا تھا۔

پھٹ، پھٹ، ٹھائیں، ٹھائیں، ٹھائیں .... رائفلیں دھواں اگل اگل کر ٹھنڈی ہوگئیں جھنڈا ان کی نحیف جھڑکیوں پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ کلکٹر صاحب نے تقریر کی۔ جنتا کو آزادی کے ایک سال کی مبارکباد دی نہیں ایک سال کو تاج محل عطا کیا۔ اور جنتا اپنے جیون میں تاج محل کو چھپائے مونگ پھلی اور دال موٹھ کھاتی، پاؤں پٹکتی کنیا اسکول کے بسنتی پیکروں کا گیت گاتی جدھر سے آئی تھی، ادھر واپس چلی گئی۔

اور میں کالج کی طرف چلنے لگا، سب لڑکے ایک ساتھ چل رہے تھے، جلوس میں کچھ پنجابی مرد اور عورتیں حسرت ناک نظروں سے انہیں گھور رہے تھے، ان کی شلواریں پھٹی ہوئی تھیں اور کچھ پنجابی مرد اور عورتیں سرسراتی ہوئی کاروں میں بہے جارہے تھے۔ سب ہی پناہ گزین، شرنارتھی۔ پر دونوں کے درمیان ایک فصیل حائل تھی۔ یہ بھی عجیب بات تھی۔

کالج میں خوب خوب تقریریں ہوئیں۔ ایک بڑے وکیل صاحب جن کا بڑی بڑی فیکٹریوں میں حصہ تھا جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔

پرنسپل بولے، پروفیسر بولے، لڑکے بولے۔ اور لوگوں نے نہرو جی کا قصیدہ پڑھا، پٹیل جی کا قصیدہ پڑھا اور آزادی کا قصیدہ پڑھا تالیاں بجتی رہیں، ہال گونجتا رہا۔ آواز گونجتی رہی، دماغ گونجتا رہا، نگاہیں گونجتی رہیں۔ میری آنکھیں بہتی رہیں، اپنے کپڑوں سے شرمسار ہوتی رہیں، پسینے کی بوئیں کود کود کر خودکشی کرتی رہیں۔ رنگین رنگین ——— چکنے چکنے کرتے، مکھن اور ملائی کی بنی ہوئی معزز عورتیں ان سبھوں کے سامنے میری آنکھیں پلک جھپکتی رہیں۔ اور پھر وہی کینل کی طرح زرد، مضمحل اور کمزور سا چہرہ ڈائس پر گیا، پہلے آہستہ آہستہ پھر زور زور سے گرجنے لگا ——— "آزادی اس وقت تک آزادی نہیں کہلا سکتی جب تک کہ جنتا کی آزادی نہ ہو، جب تک پونجی پتیوں، ٹاٹاؤں، برلاؤں کا خاتمہ نہ ہو، زمینداری کا ناش نہ ہو اور ہم نے دیکھا ہے، اس آزادی نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ یہ آزادی جنتا پر حکومت کرنے کی آزادی ہے۔ یہ آزادی جنتا کی حکومت بنا دینے والی آزادی نہیں ہے دویا رتھیوں کو چاہئے کہ ——— " میری گھگھی بندھ گئی تھی۔ آخر یہ کیا بکواس تھی۔ اور ٹھیک ہی کیا پرنسپل نے اسے ڈائس سے اتر جانے کا حکم دیدیا۔ صدر نے بار بار ریشمی رومال سے اپنی عینک کا شیشہ صاف کیا جیسے اس لڑکے نے اس پر کالک تھوپ دی تھی اور کہیں ہر طرف اندھیرا معلوم ہو رہا تھا، لیکن لڑکے کے ہٹتے ہی ہر طرف ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ صدر کی باوقار مسکراہٹ لوٹ آئی اور عینک کا شیشہ صاف ہوگیا، دھواں چھٹ گیا اور پھر انھوں نے تقریر کی اور پھر انھوں نے ایک لچھے دار حکومت اور نہرو جی کی شان میں قصیدہ پڑھا۔

لڑکے کینل جیسی زرد آنکھ والے لڑکے کو گھیرے ہوئے تھے، اس سے ہمدردی کر رہے تھے، کوئی اس پر آوازے نہ کس رہا تھا ہر لڑکا جیسے اس کی بکواس کا شکار ہوگیا تھا، پرنسپل کے خلاف ان کا غصہ بڑھ رہا تھا اور ہال خالی ہوتا چلا گیا۔ صدر نے جلدی سے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا روغن دار قصیدہ ختم کیا۔

میں پرنسپل کے حکم پر کالج میں ٹھہر گیا۔ اب شام کی پارٹی کا انتظام کرنا تھا، میز درست ہوں، مٹھائیاں درست ہوں اور کسی کو شکایت نہ ہو۔

شام کے وقت کسی کو شکایت نہ ہوئی۔ کیک، بسکٹ، آئس کریم، ملائی کیک، رس ملائی، اخروٹ، پستہ، بادام، چلغوزہ بھنے ہوئے چاپ اور ان کی متحدہ یلغار میری ناک پر اور سرنگ کے اندر میری روح پر اور میں تلملاتا رہا۔ میں نے صرف رکھی چار رس گلے چرا کر کھائے تھے۔ دو چاپ کھائے تھے وہ بھی ڈبل چاپ اور کچھ اٹھا ہی نہ سکا، سب بھڑکے ننگے چپراسی کھڑے ہوئے اور دیونندن نے کہا تھا "جو کل روپیہ لینے آئیگا۔ چاول گھٹ گیا ہے۔ اور۔ جمنا کی ماں دھتکارتی ہے بے فجول کو۔"

میں الٹا معلق ہوگیا۔ میں کچھ بولا ہی نہیں، کچھ بول ہی نہ سکا صرف معلق ہوگیا۔ مولوی صاحب نے ایک بار درخت سے الٹا لٹکا کر مجھے خوب پیٹا تھا اور نیچے ببول کے کانٹوں کا بچھونا لگوا دیا تھا اور اس میں بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی تھی جتنی کہ اس وقت ہو رہی تھی۔ معلق فضا میں نہ درخت، نہ ببول کے کانٹے، نہ مولوی صاحب کی چھڑی، نہ ان کی گھن گرج۔ بس معلق ادھر ادھر سناٹا ہی سناٹا۔ اور میں دس بجے رات کے وقت اپنے محلے میں پہونچنے سے پہلے ایک ہوٹل میں ٹھہر کر چائے پینے لگا۔ چار آنے پیسے میں نے کالج کے رکھے تھے۔ پیٹرومیکس لینے گیا تو رکشے والے کو ڈانٹ کر کم ہی پیسے دیئے۔ چلو چائے تو چل گئی۔ بہت سے بیفکرے بیٹھے تھے۔ جنھیں صرف گپیں ہانکنا آتا ہے۔

"سنا ہے مٹھائی نے، نئے وزیر نے ریل گاڑی میں پنکھا لگوا دیا ہے ——— ارے تھرڈ میں، تھرڈ میں ———"

"اچھا ———"

"ہاں بے کوئی جھوٹ کہتا ہوں، مٹھائی میرا باپ ہے کیا ——— ؟"

"نہیں تمہارا باپ تو حجام ہے پر یار سنا ہے پنکھے لگے ضرور ہیں، مگر سیٹ کے نیچے لٹک گئے ہیں اور وہاں سے

ہوا کا وہ جھونکا آتا ہے کہ بس ہوائی جہاز پر اُڑتے جا رہے ہیں۔

ایک کالے بھجنگ سے آدمی نے اپنی کھچڑی مونچھوں کو اینٹھتے ہوئے کہا ——— "پنکھا پنکھا۔ ارے دیکھ نہیں آزادی کا بڑے بڑے لوگوں کا مزا ہے۔ ہم لوگوں کا کیا ہے، کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ نہ مزدوری بڑھی، نہ چیزیں سستی ہوئیں۔ پھر آزادی کیا ہوئی۔ ووٹ لیتے وقت تو کہا تھا لفافہ اور پوسٹ کارڈ مفت لیں گے، مفت میں، اور اب چاول اور دال بھی سستے داموں پر"

میں اُٹھ کر چلا آیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا، دور ریلوے کی کوٹھیوں میں چراغ جل رہے تھے۔ جیسے دور سے ہزاروں بلیوں کی آنکھیں چمک رہی ہوں۔

میرے کمرے کے سامنے بھیڑ لگی ہوئی تھی، میرا دل دھک سے ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے زینب نے کوئی نیا گُل کھلایا ہے۔ سلامت کراہ رہا تھا اور لوگ ہمدردیاں جتا رہے تھے۔

"کسی کی جان جائے، آپ کی ادا ٹھہری ———"

"ہائے بیچارہ بہت اونچے پر سے گر گیا۔ بوڑھا ہوا۔ مگر پیٹ مانے تب نا"

سلامت بالکل بیہوش سا پڑا ہوا تھا، وہ صرف کراہ رہا تھا، زینب رو رہی تھی، میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا، جیسے اس پر سے پپڑیاں چھڑانے کی جدوجہد کر رہا ہوں۔

آہستہ آہستہ سب لوگ چلے گئے منشی غنی کے یہاں رات کی دعوت تھی اور زرد زرد دیوار پر برسات کے پانی نے بہت سے بڑے بھلے نشانات چھوڑ دیئے تھے۔ سلامت انھیں مٹانے کے لئے اوپر چڑھ گیا تھا، لیکن آزادی کا جلوس اُدھر سے گذرا، لڑکیوں کا جلوس، باجے اور ترانے ——— اور پھسل کر نیچے آ رہا۔ اس کا ہاتھ بالکل چور ہو گیا تھا اور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، انگلیاں مڑ گئیں تھیں، روئی سے اس کی مٹھی میں دو اور کھ کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

سناٹا ہو گیا، صرف تین مکانوں سے زندگی للکار للکار کر جھپٹ رہی تھی، قہقہوں، جھانگ کی جھنکاروں، پٹاخوں، نغموں سے ماتم کراہوں میں جکڑی ہوئی زندگی۔ ہنستی، مسکراتی، ابھرتی اور رقص کرتی ہوئی زندگی۔

میں چپ چاپ کمرے میں بیٹھ گیا۔ زینب کی سسکیوں کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ البتہ کبھی کبھی تین مکانوں کے شعلے لپک کر اس آواز کو جلا دیتے تھے، لیکن اس کی سسکیاں بڑی سخت جان تھیں۔ میری بھوک مر گئی تھی، رس گلے کی ڈکار ابھی تک آ رہی تھی۔ چاء کا مزہ سوئی کی طرح چبھ رہا تھا۔

میں انجانے طور پر سالگرہ کے جشن کا تجزیہ کر رہا تھا، ایک طوفان سارے دماغ میں پھر رہا تھا۔ اجلی اجلی کوٹھیوں، بڑے جھنڈوں، ریشمی کپڑوں، سرکتی کاروں، جھکتے قہقہوں کا ہیجانی طوفان اور دوسرا طوفان بھی اُٹھ رہا تھا۔ میلی میلی دھوتیاں، پسینے میں بسی ہوئی قمیصوں، پان کی پیکوں، دھوئیں کی عفونتوں، کینل کے پھول کی زرد مسکراہٹوں، سلامتوں اور زینبوں کا طوفان اور دونوں طوفان ایک دوسرے ہلاکت آفریں تصادم میں کھو گئے تھے ——— اور ان میں گھر گیا تھا اور کھوئے ہوئے احساسات کی جھرمٹ میں ایک چراغ جل اُٹھا اور درخت کے اتنے بڑے الفاظ نازک نازک کومل کومل، سادہ سادہ الفاظ جھپٹ اُٹھے اور ایک چیخ میرے سر سے لیکر پاؤں تک ایک جلتی ہوئی سلاخ کی طرح پیوست ہو گئی اور وہ سلاخ سلگتی رہی ———

——— شہر نے چلو، مجھے شہر نے چلو ———"

کیا نادانی ہے۔ میری شاردا تمھیں کس نے بہکایا ہے، شہر میں بھوت رہتے ہیں۔ کون کہتا ہے یہاں ڈاکٹر رہتے ہیں کون کہتا ہے یہاں کاریں بھاگتی ہیں، کون کہتا ہے یہاں پھول سے لدے ہوئے باغ ہیں، زینب ہے اور میں ہوں اور ہم میں سے کوئی بھی انسان نہیں، سب وحشی ہیں، اس لئے اس ویرانی میں جی رہے ہیں، تم عورت ہو، نازک ہو۔ تم

اپنے اندر ایک قندیل جلا رہی ہو، تم یہاں نہیں رہ سکتیں، وہ قندیل بجھ جائیگی، اس لئے وہیں رہنا اور دیکھو سہیلیوں سے بازی نہ لگانا کر دوسوں میں دھوکا کھا جاؤگی۔ اور کہو کیسی ہو۔ اب تو تم کافی تندرست ہوگئی ہوگی۔ دوا سے کچھ نہیں ہوتا اصل چیز تو دل کی بیفکری ہے۔ میں تم سے جلدی ملوں گا اور تمہارے لئے بہت سی چیزیں لاؤں گا ـــــ اور کہو ـــ میں تو تمہارے لئے بیچین ہوں۔ ایک لمحہ بھی نہیں سکتا۔ لیکن اس ویرانی میں پھنس گیا ہوں۔ اس دلدل سے نکل بھی تو نہیں سکتا ـــــ

ـــــ لیکن کوئی بات نہیں ـــــ "

دور سے وہی مانوس سیٹی سنائی دی، ایک بار، دو بار، تین بار ـــــــــ اور سیٹیاں ختم ہوگئیں اور ایک سایہ اٹھکر چلا گیا

ـــــ سلامت کی کراہ ختم ہوگئی۔

جگور۔ کل روپیہ لیتے آجنگا۔ جمنا کی ماں بہت ـــ جگور، جگور "

میرے سر پر دو ہزار جوتے تھی اور سکھن پٹائے ہوئے جوتے، ورزش کرکے تھک گئے۔

ٹھہرے چلو ـــــ ٹھہرے چلو ـــــ

کل روپیہ لیتے آئے گا۔

" پانی۔ پانی " سلامت پھر کراہنے لگا۔

جب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسی وقت دور سے پٹاخوں کی آواز آئی اور بنیں والی کھڑکی سے سریلی آوازیں جھانگل اور ستار پر اڑتی ہوئی آئیں اور کمرے میں سائیکلوں کی طرح ناچ گئیں۔ جب میری نظر سلامت کے پلنگ پر پڑی تو ہر چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی نظر آئی، سر اس کا پٹی سے جکڑا ہوا تھا اندھیرے میں دھندلا۔ دھندلا نظر آیا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ اس کی مٹھی میں روئی اور دوا نہیں ہے، بلکہ وہ ایک چاندی کا لڈو ہے۔ اپنے اس وہم پر میں آپ ہی آپ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ کمرے کی ایک ایک چیز ہنس پڑی۔ ٹھٹھر گئی۔ پسینے کی بو اور ساندا ہوا اندھیرا تک ہنس پڑا ـــــ

ہاں تو اس روز پندرہ تاریخ تھی اگست کی، اور دوسرے روز سولہ تاریخ تھی اور مجھے کالج جانا تھا۔ ویہ نندن کا پانچ روپے کا قرض توڑنا تھا، ـــ اور جانا ہی تھا۔ اس لئے کہ میں اس کالج میں اب کلرک ہوں ـــــ

ستار، گیتوں اور جھانگلوں کی آواز کے مٹنے کے بعد سلامت کے ہاتھ میں چمکتا ہوا چاندی کا لڈو بھی زور سے ہنس پڑا اور میں نے موم بتی بجھا دی۔



اشتیاق عارف

اُٹھان!

——— اور اس وقت اس کے دل میں یہ تمنا جاگ اٹھی کہ کاش اس نے تھمی ہوئی زندگی کو چھوڑا ہی نہ ہوتا۔

بات بات میں ذرا ذرا سی اُلجھنیں اس کے دماغ میں بخار کی گرمی پیدا کر دیتیں اور پھر وہ تلخی بھری جھنجھلاہٹوں میں جکڑ جاتا۔ ایسے وقت میں اس کے ذہن پر اس کی پچھلی زندگی کے نفع و نقصان کا تختہ بچھ جاتا، جہاں بیشمار رستوں کے ساتھ ساتھ بہت سی جگمگیں باتیں ہوتیں، یہ دیکھ کر اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگ جاتا۔ اور پھر اُسے اختلاجی دورہ دبوچ لیتا، ساتھ ہی گذرے ہوئے واقعات کا فیتہ تیزی سے سرکنے لگ جاتا ——— کرنل صاحب کی ہتک آمیز باتیں، باپ کی شفقت میں ڈوبی ہوئی باتیں، ضعیفی سے ہمکنار ہونیوالی ماں کی لجاجت آمیز نصیحتیں۔ بھادوں میں بڑھتے ہوئے دھان کے پودوں کی طرح جوان جوان بہنیں اور ان کی خاموش نگاہوں میں امنڈتے ہوئے آنسوؤں کی چمک ——— وہ پاگل سا ہو جاتا۔

بہنوں کے آنسوؤں کے پیچھے دبی دبی آوازیں اٹھتیں "بھائی جان تمھیں نے تو ہمیں جینے کی آس بندھائی تھی۔ ہماری بڑھتی ہوئی جوانیوں کو سہارا دیا تھا کہ نگھبراؤ تم سب کی اچھی جگہ شادیاں کروں گا۔ میرے جوان دوست زندگی کی بڑی خوشیوں کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، ان میں کئی دوست بڑے آدمی بن جائیں گے، میں اپنی پیاری بہنوں کے لئے ایسے ہی شوہر لاؤں گا"

اس نے ان کے متعلق ایسا ہی سوچا تھا۔

اس ذہنی زلزلے میں پھنس کر کبھی کبھی تو اس میں سچائی سے سوچنے کا شعور جاگ اٹھتا اور اُسے یاد پڑتا کہ اس نے اپنے باپ سے بھی اس طرح کے کئی خاموش وعدے کئے تھے۔

"ابا جی! آپ کیوں اتنی فکر کرتے ہیں ——— میں آپ کو اس پلکتے ہوئے بڑھاپے کی اجاڑ آغوش سے باہر نکالنے کے لئے مصائب سے ٹکراؤں گا، میں نوجوان ہوں، مجھے لکھنا آتا ہے۔ میں کہانیاں لکھ کر پیسے وصول کروں گا، میں آپ کو زندگی کی کشمکش میں بیچ راہ میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اتنا بزدل نہیں ہوں۔ میں آپ کے لئے اپنا دل و دماغ فروخت کر دوں گا۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے ابا جی! ہم سب بہن بھائیوں کو پروان چڑھاتے چڑھاتے آپ کے مضبوط شانے ذمہ داریوں کے بوجھ سے دب کر نیچے کو ٹک چکے ہیں"

وہ اپنے پریشان حال باپ سے اتنے اچھے وعدے کرتا کہ اس کا باپ ذرا دیر کے لئے خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا اور اس وقت اس کے لمبوترے چہرے پر اونچی اٹھی ہوئی ناک سرخی مائل ہو جاتی۔

باپ کو وعدوں کے فریب میں مبتلا کرتے ہوئے نہ جانے کیوں غلطی سے بھی اس کی زبان پر ماں کا ذکر نہ ہوتا تھا، جس نے اسے جنم دیا تھا اور جس کی بے پناہ محبت کے احساس سے اس کا جی چاہتا تھا کہ کبھی کبھی ٹھٹک کر اس کی گداز چھاتی پر اپنا سر ٹکا دے اور اس کی ماں اس کے گالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہے، جیسے وہ ابھی چھوٹا سا بچہ ہی ہے۔ لیکن مستقبل کی خوشحالی اور انوکھی تمناؤں کا مبہم سا احساس ہوتے ہی ماں کی عظمت کم ہونے لگ جاتی اور اس کا وجود کمزور ہو کر تنہائی پس منظر میں جا پڑتا، گویا اس کی حیثیت خاندان کے ایک اہم فرد کی نہیں رہتی تھی جس کا مستقبل کے خانوں میں ذکر کیا جاتا۔ ایسے موقعوں پر وہ دیدہ و دانستہ ماں کو نظر انداز کر کے خوش ہوتا تھا، جن کی پرورش کرتے کرتے اس کا باپ وقت سے پہلے بوڑھا ہو رہا تھا۔ وہ اور زیادہ سوچ کر زیادہ سنجیدہ ہو جاتا، یہاں تک کہ اس کے کانوں کے پاس ہزاروں مکھیوں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگتی، وہ اور زیادہ بے بس ہو جاتا۔

کبھی کبھی وہ اور ریحانہ دونوں الگ الگ اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچتے لیکن بالآخر وہ اپنی اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے جیسے کسی نے کوئی غلطی نہیں کی اور کسی نے کچھ کھویا نہیں ان کی محبت اب بھی تازہ تھی۔

کرنل صاحب نے اپنی سماجی حیثیت، اپنی اونچی سوسائٹی اور اپنے ظالمانہ وقار کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی جاپانی لڑکی کو کچل ڈالنا چاہا، وہ ریحانہ کے لئے کسی سجیلے لفٹیننٹ کی تلاش میں تھے۔ ویسے وہ اسے بھی "شائننگ" سمجھتے تھے، لیکن اپنی لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کا تصور کرتے ہی وہ جھلا اٹھتے۔ انھیں تمام چمکدار چیزیں چھوٹی اور گھٹیا نظر آنے لگتیں اور پھر ان کے غرور کا جامہ ایکدم سے بڑھنے لگتا۔ ایسے موقع پر ان کے اندر انسانیت کم ہو جاتی اور کرنیلی زیادہ ابھر آتی۔

اس کے بوڑھے اور شریف باپ نے جب کرنل صاحب سے ان کی لڑکی کا ہاتھ حاصل کرنے کی بات شروع کی تو اگرچہ اس کے باپ کی تمام پسماندگیوں کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا تاہم وہ ایک اچھے بچے کے باپ کا زعم لئے ہوئے تھا۔ کرنل صاحب تلملا اٹھے ان کی شرافت نے اس کے باپ کی انتہائی لجاجت کی پرواہ کی۔ ان کا غرور پھنکاریں مارنے لگا۔ اس سے زیادہ ذلت کے لئے وہ تیار نہیں تھے کہ معمولی حیثیت کا ان کا ایک پڑوسی ان کی لڑکی کو اپنے لڑکے کے لئے مانگ سکے گا۔ چھوٹے بڑے کا امتیاز، ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق، پٹھان اور سید کی تمیز سے ان کا دجود بوجھل ہو رہا تھا، وہ معاملہ کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکے۔ دو نوجوان دلوں کی تڑپ انھیں محسوس نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنے سب سے شریف پڑوسی کو بیہودہ سا جواب دیدیا، یہی نہیں بلکہ انھوں نے کہدیا ——

"میں اپنے نوکر کے لئے کوئی موزوں لڑکی تلاش کر رہا ہوں سنا ہے آپ کی دو تین لڑکیاں شادی کے قابل ہیں، کیا خیال ہے آپ کا؟"

پھر ریحانہ اور وہ دونوں ایک دن اپنا سب کچھ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ بوڑھے ماں باپ اور تین کنواری بہنوں کی التجائیں اُسے گھر چھوڑ کر جانے سے نہ روک سکیں، اس کے سامنے زندگی کا ایک بڑا مقصد تھا، اس کی تمام مسرتیں اور آرزوئیں اسی مقصد کے قریب سمٹ آئی تھیں۔ ریحانہ جیسی کھلے دل سے محبت کرنیوالی لڑکی اس کا آئیڈیل تھی اور اپنے آئیڈیل کو حاصل کرنے کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ افسانوں میں اپنے "لاحاصل مدعا" کا ذکر کیا کرتا تھا اور اپنے جی میں خوش ہوتا تھا کہ بہت سے لوگوں نے اس کے تخیل کی رومانٹک دنیا کو اپنانے کی ضرور آرزو کی ہوگی اور اب جیسے اس لڑکی نے اس کے ہیجان افسانوں میں زندگی دوڑا دی تھی اس کے پیچھے دوڑنے سے روکنے میں اگر ماں کا پیار روٹھ گیا، باپ کی شفقت میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تو کیا ہوا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں رک سکے۔ دونوں کے بھاگ جانے پر پرانی نسل کے لوگوں کو بامزہ کے چرچا ہوں، ہونٹوں کے گوشوں اور محفلوں میں بات چلنے کا ایک سنسنی خیز موضوع مل گیا تھا، جوان اور کنواری لڑکیوں کی حفت اور نوجوانوں کی بیہودگیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا ایک ہی موقع ہاتھ آیا تھا، کیونکہ ایک ذہین اور ہونہار نوجوان نے دلیرانہ پیشقدمی کر کے اعلیٰ سوسائٹی کی ایک تتلی کو اپنی مرضی سے زندہ رہنے اور اپنی خوشیوں کو پورا کرنے کی بات بتادی تھی۔

★ ★

پھر اطمینان سے سوچنے کا دور آیا، طوفان کے گذر جانے پر جس طرح کی کیفیت ہوتی ہے۔ ان دنوں گھر آتے ہی اس کا چہرہ کھلتا جاتا روزمرہ کی زندگی میں بعض اوقات جب وہ یہ سوچتا کہ ریحانہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی یا اگر جانتی بھی ہے تو بہت کم —— اور دوسرے لمحہ میں اسے یکایک پتہ چلتا کہ ابھی ابھی وہ جو کچھ سوچ رہا تھا ریحانہ اس سے واقف تھی۔ وہ ریحانہ کی نظروں میں اس کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھا جس میں اچھائیاں اور برائیاں لکھی ہوئی ہوں —— اس کا خیال تھا کہ وہ اسے ایک ایسے بچہ کی طرح سمجھتا تھا جسے پڑھا لکھا کر غارت کر دیا جاتا ہے وہ بحیثیت مجموعی اس کے سامنے اسی قسم کا ایک بچہ تھی۔ کم از کم اس نے آزاد زندگی میں اسے اب تک ایسا ہی سمجھا تھا مگر ریحانہ کو رفتہ رفتہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس کی خوبیوں کو نہیں چاہتا، ویسے اس میں ایک عام لڑکی سے بہتر خوبیاں تھیں بھی نہیں۔ ریحانہ کے خیال میں وہ ایسی عورت نہیں تھی جو اس کے برابر کہی جا سکے۔ اس کی زندگی اس کے خیالات اور آرزوؤں کی

شریک دار بن سکے۔

جب کبھی وہ اس سے اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے جھوٹ بولتا تو اسے یہ ضرور یقین رہتا تھا کہ ریحانہ جھوٹ کو سچ نہیں سمجھیگی۔ ریحانہ کو بیکار جھوٹ بولنے سے وحشت سی ہونے لگتی۔ اس کے ذہن میں سوال قائم ہونے لگتا "سرکار تم مجھے سچی باتیں کیوں نہیں بتاتے" ریحانہ کو ہر بات کا یقین دلانے کے لئے اس کے پاس کوئی معقول عذر باقی نہیں ہوتا تو وہ کرکے اس سے سوال کر بیٹھتا "تم دوسری باتوں کے متعلق کیوں سوچتی ہو" تب ریحانہ کی بھوری بھوری آنکھوں میں غم انگیز پھیلاؤ پیدا ہو جاتا جیسے انھیں کوئی ایذا پہونچی ہو۔ وہ الجھ کر اس کا منھ تکنے لگ جاتی۔

وہ کبھی غلطیاں کر کے خود کو الزام نہیں دیتا تھا وہ کبھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اسے کونسی چیز الجھن میں مبتلا کر سکتی ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر سلجھا ہوا انسان سمجھتا چلا آیا تھا۔ اسی ذہنی گھٹن کو دبانے کے لئے وہ غلط بیانی سے کام لینے لگا تھا جس کا بالکل فطری طور پر ریحانہ میں ردِ عمل ہونا شروع ہو گیا۔ اس نے بہت پہلے یہ موہوم سا گمان قائم کیا تھا کہ وہ اس کے قابل نہیں ہے اور نہ بن سکتی۔ یہ بات صحیح ہوتی جارہی تھی۔ کم از کم اپنے شوہر کے موجودہ رویّہ سے اسے یہی پتہ چلتا تھا۔ ریحانہ نے اس کی ذہنی تربیت کو دیکھ کر آغازِ محبت کے زمانے ہی میں صاف کہدیا تھا "میں عملی زندگی میں تمھارے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔ مجھے ڈر ہے میں تمھارا ساتھ نہ دے سکوں گی۔ کتابوں کے مطالعہ اور وسیع معلومات نے تمھیں بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ کوشش کر کے بھی میں تمھاری برابری نہیں کر سکتی۔ مجھے ہر وقت تمھاری عظمت خوفزدہ بنائے رکھے گی"

کسی وقت جذبات سے خالی ہو کر جب وہ عملی زندگی کی نئی تلخیوں پر غور کرنا چاہتی تو مایوسی کی ابتدا یہاں سے ہوتی تھی کہ وہ اسے بچہ سمجھتا تھا یا بچوں جیسا برتاؤ کرتا تھا۔ اس کے بعد بھی اس کا خیال تھا کہ دونوں کے درمیان کسی حد تک ہم آہنگی ہے، اور دونوں ایک دوسرے سے مطمئن ہیں۔ کئی مرتبہ ریحانہ نے خود کو ان جھوٹی تسلیوں سے مطمئن کرنا چاہا کہ میں نے اسے اس لئے نہیں چاہا تھا کہ وہ بہت زیادہ ذہین ہے اور بہت ساری باتیں جانتا ہے، یا سیکڑوں کتابیں پڑھ کر اسے خوش و خرم زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آگیا ہے۔ لیکن وہ اس یقین سے کس طرح گریز کر سکتی تھی کہ اس میں ان خوبیوں کے علاوہ اور کوئی خوبی بھی نہیں تھی۔ اب اس کے شوہر کی شخصیت رفتہ رفتہ دو حصّوں میں منقسم ہوتی جارہی تھی۔ اس کی ذہنی صلاحیت اور علمی قابلیت سے جو نئی ہستی وجود میں آئی تھی وہ اس سے جھجکنے لگی تھی۔ لیکن محبوب شوہر کی حیثیت سے وہ اسے ہر وقت محبوب تھا۔

اب مہینوں قریب رہنے کے بعد ریحانہ کے جوان اعضاء میں ہلکا سا اضمحلال پیدا ہو چلا تھا اور اندر ہی اندر ایک ناقابلِ یقین خوف کے احساس سے کبھی کبھی وہ ملیں بھی رہتی تھی۔ ناکامیوں کی جھلک سامنے آتے دیکھ کر اس میں یہ خوف بڑھنے لگا تھا کہ کہیں آگے چل کر اس کی قسمت بھی بھاگی ہوئی لڑکیوں کی طرح نہ بن جائے اور اسے بھی دائمی مصائب نہ اٹھانا پڑیں۔ اس وقت اسے ماں کی یہ نصیحت یاد آتی کہ عورت کی زندگی کے ہر نشیب و فراز میں مجبوریاں ہی مجبوریاں ہوتی ہیں اور وہ کسی پہلو بھی آزادی کا سانس نہیں لے سکتی۔

★ ★

ریحانہ نے فلمی کالم کو ادھورا پڑھ کر رسالے کو سینے پر کھد چھوڑ دیا اور ریٹ لیٹے اوپر کو گردن اٹھا کر شوہر کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر خفّت سے تلملا کر وہ اٹھ بیٹھی۔

"ذرا میری طرف دیکھئے!"

"اوں ہوں" ——— اس نے جھنجھلا کر قلم کو میز پر ٹپک دیا اور کرسی کو گھما کر ریحانہ کے سامنے اپنا چہرہ کر دیا ——— کیا بات ہوئی؟"

"کوئی فلمی کہانی لکھی ہے آپ نے ؟"

"ہاں بہت دن ہوئے، تمھیں کیسے معلوم ہوا ؟"

"اس رسالے میں لکھا ہے" اس نے رسالے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا "لیکن آپ کو فلمی کہانی لکھنے کا کب سے شوق ہوا ؟"

وہ کرسی سے اس کے نزدیک آتے ہوئے بولا "یہ کہانی میری زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ہوگی"

"لیکن آپ نے مجھ سے اس کا ذکر تک نہیں کیا"

اس نے ہنستے ہوئے ریحانہ کی سپید و سرخ ٹھوڑی کو ہاتھ میں لیکر اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا "ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تم اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی لیتی ہو"

وہ اس کے آگے کیا کہتی البتہ اس کا دل بول اُٹھا "آپ نے یہ خیال کیوں قائم کر لیا، آپ کی زندگی کے سب سے بڑے کارنامے میں کیوں کر بے تعلق رہ سکتی ہوں، میں آپ کی زندگی کی ساتھی ہوں۔ مجھے اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے آپ کی امنگوں اور ولولوں میں برابر کا ساجھی بننا ہے" یہ باتیں اگر وہ زبان پر لے آتی تو اس کا اثر ہی کیا ہوتا۔ اس کے شوہر کی خواہش تو یہ تھی کہ بس وہ ہمیشہ کی طرح دلفریب نظر آئے۔ کھانا پکا دیا کرے اور جب وہ دن بھر کے بعد تھکا ماندہ گھر آئے تو اسے راحت پہونچائی جائے۔

اس کے بعد ریحانہ میں بے اعتمادی کا تلخ احساس اندر ہی اندر ابھرتا گیا اور اس کے دل سے شوہر کی عظمت دور ہوتی گئی۔ تاہم اس کے بوسوں میں وہی پہلی سی بیتابانہ گرم جوشی تھی۔ تھکن اتارنے کے لئے اس کی پیشانی پر اسی پیار بھرے انداز میں اس کا ہاتھ پہونچتا تھا۔ ایک نفرت کی طرف اور دوسرا محبت کی طرف مائل تھا۔ اور اس وقت دونوں کے دلوں میں یہ خواہش ہوتی کہ کاش انھوں نے اپنی پچھلی زندگی کو چھوڑا ہی نہ ہوتا۔

چند ماہ بعد ریحانہ کو بیہوشی کی حالت میں اسپتال پہونچا دیا گیا، جہاں اس نے محبت اور نفرت کے درمیان ایک نئے وجود کو جنم دیا۔ وہ ریحانہ کے سرہانے بے ڈھنگے پن سے کھڑا ماں اور بچے کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ریحانہ نے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ پہلے سے زیادہ متفکر نظر آ رہا تھا۔ اس پر وحشت اور الجھن سوار تھی۔ ریحانہ نے نقاہت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اسے سارا کمرہ چکر کھاتا نظر آنے لگا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ حقیقتوں کے سامنے اسے کوئی راہ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب وہ ریحانہ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔ پچھلی زندگی کی طرف مراجعت ایک خوفناک جرم تھا جس کی تحریک بزدلی نے کی تھی۔ اب کچھ بھی ہو اسے گھریلو زندگی کے نقشے میں مسرت کا رنگ بھرنا ہی پڑیگا۔ مصیبتوں کا مقابلہ کرنے میں بھی ایک طرح کی روحانی آسودگی ملتی ہے اور اس سے پناہ دینا انتہائی بزدلی ہے۔ انسان کشمکش کو جاری رکھنے کے لئے کافی عرصہ تک زندہ رہتا ہے۔ اسے بھی اپنے بچے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔

اس کے سینہ میں ایک نیا جوش امنڈ آیا اور دوسرے لمحے وہ ریحانہ پر جھکا ہوا کہہ رہا تھا "مجھے معاف کر دو ریحانہ! میں نے تمھاری بڑی دل شکنی کی ہے" ——— "نہیں میرے سرکار!" اس نے نقاہت سے ہاتھ ہلایا ——— "میں ہمیشہ خود کو تم سے بڑا سمجھتا رہا یہ میری بھول تھی" ——— "پہلے ہم کتنے خوش رہتے تھے! یاد ہیں وہ دن؟" ریحانہ نے گہری سانس لی۔

"بات یہ ہے کہ جب ہم تم اتنے قریب ہو گئے کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سن سکیں تو ہم میں ایک دوسرے کی نفرت پیدا ہو گئی" فقط یہی ریحانہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اور اب ہم پھر ایک دوسرے سے قریب ہوئے تو نفرت دور ہو گئی۔ ہے نا ——"

وہ دونوں ایک ساتھ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

بہت دنوں سے ان دونوں کے اندر جو نئے آدمی پیدا ہو گئے تھے ان کی خود بخود موت واقع ہو گئی۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کے جلسہ میں پڑھا گیا) ————

　

ایم شکیل

نئی تصویریں

صبح کی ہلکی سفیدی ہر طرف بکھری تھی - ایک طویل بھیانک اندھیری رات کے بعد روشنی کی پہلی کرن پھوٹی - سو برس کی غلامی کے بعد آزادی کی دیوی کے پاؤں کی جھنکار گونجی تھی - روشنی! سوراج ——— بدیسی گوری چمڑی اور سیاہ دل کے سنگدل عیاش حکمراں جا چکے تھے اور سڑکوں پر کالے افسر سینہ آگے کو تانے مونچھوں پر بل دیتے اکڑتے چل رہے تھے - ہر طرف سے فوجی بگل کی وہ سریلی تال سنائی دے رہی تھی جو پریڈ کرتا ہوا لشکر بجاتا شہر کے سب سے بڑے بازار کی طرف آرہا تھا - دنیا حیرت سے گوتم کی زمین کی طرف دیکھ رہی تھی اور گوتم! (نہ جانے کیوں اپنی ہی دھرتی سے روٹھ گیا تھا) - قوم کے رہبر ملت کے ناخدا آج اُن عالیشان محلوں کے ان مخملی گدوں پر بیٹھے تھے جہاں کل تک ——— لیکن کل کی بات سے فائدہ؟ کل کی بات کہاں ہے - آج اور کل میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے - گذری ہوئی باتوں کو گذرے ہوئے زمانہ کے ساتھ بھول جانا ہی دانشمندی ہے - ملک و قوم کو زندگی کے لئے اپنا منہ "ماضی" نہیں "حال" کی طرف کرنا پڑتا ہے ——— کل نہیں آج -

رقص کا شباب بڑھ رہا تھا - کرن پھیل رہی تھی - گلاب کی کیاری میں کلیوں نے آنکھیں کھول دی تھیں - ساری برسوں کی اونگھتی ہوئی فضا جاگ گئی تھی - ملک جاگ گیا تھا، دنیا جاگ گئی تھی - کیف و مستی کے چند لمحے بھی کتنے حسین ہوتے ہیں - قومی پرچم اس قلعے کے سب سے اونچے مینار پر جہاں بابر، تیمور، شیر شاہ اور نادر کے علم گر چکے تھے آج کھڑا جھوم جھوم کر مسکرا رہا تھا - یہ جوانی کا نشان تھا، زندگی کا علم تھا، جھنڈا قومی غرور سے سرشار انگڑائیوں پر انگڑائیاں لے رہا تھا - کسی شہنشاہ، کسی سکندر کا پرچم نہ تھا جو تلوار کے زور سے قلعے پر گاڑا گیا تھا یہ جمہور کا نشان تھا، جمہوریت کا پاسبان تھا جو تاریخ میں پہلی بار اہنسا کی قوت سے کل پر ہندوستان کی راجدھانی پر لہرا رہا تھا - بہت سے شاہوں کے پرچم، شہنشاہیت کے نشان گڑے، اور اکھڑے تھے لیکن جمہوریت کا پرچم، جس کے سائے میں بھارت کے چہیتے بھگت سنگھ آزاد، بسمل جیسے بیٹوں نے ہنستے ہوئے جام شہادت پیا تھا، ماں کے گلے سے طوق غلامی نکالنے کے لئے دھرتی کو لال بنایا تھا - آزادی کے پودے کو سینچنے کے لئے جوانیاں جیل خانوں میں گزار دی تھیں - وہ پرچم پہلی بار اونچی اداؤں سے وقار سے تحریک آزادی کے سب سے بڑے رہنما سب سے بڑے قوم پرور جانباز جرنل کے ہاتھوں لہرایا گیا تھا - ایک تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا سرکش باغی تھا - آزادی کے پھولوں کا رس چرانے، سورج کی کرنوں میں نہانے، سوراج کے موتی لانے تاکہ ان سے وہ بھی ہار گوندھے - محبوبہ نہ سہی لیکن اس کا آدرش تو ہے جس سے اسے محبت ہے اور وہ اس کے گلے میں وہ ہار ڈال دیگا - ہاں یہ سچ ہے کہ دنیا اسے آوارہ کہتی ہے - سماج اسے مجرم تسلیم کرتا ہے اور حکومت کے لئے وہ ایک خطرناک ہستی ہے، پھر بھی وہ انسان ہے - اس کے پہلو میں دل اور دل میں ارمان ہے وہ اپنی بانسری پہ نئے راگ بجاتا، نئے گیت بنانا چاہتا تھا - تاریخ اپنا ایک صفحہ الٹ چکی تھی - انسان ایک قدم آگے بڑھا تھا - ایک لہر نے سب کچھ بدل دیا تھا - اور وہ بھی نئے راگ، نئی جوانی، نئی کہانی کی جستجو میں تھا -

"تم کہانی لکھ کر کیا کرو گے؟" لوگ اس سے پوچھتے -

"میں مستقبل کی نئی نسلوں کے لئے آج ہی سے ایک ایسے ادبی آکاش کی تخلیق کر رہا ہوں جس پر وہ ستاروں کی طرح چمکیں گے"

اور پھر وہ ——— اجنبی لوگوں اور کسی دوسری دھرتی کی طرف چل دیتا ——— آہ غریب خانہ بدوش!

★ ★

مجھے آپ سے پوری پوری ہمدردی ہے مگر کیا عرض کروں - آپ سے کیا پردہ - آگے جو کچھ آپ پڑھیئے گا وہ کوئی حسین کہانی نہیں -

نہ یہ کوئی جوان لڑکے اور کسی غریب دوشیزہ کے عشق کی داستان ہے، نہ یہ کوئی ایسا افسانہ ہے جس میں جنس پر کوئی اچھوتا پہلو پیش کیا گیا ہو جس کو پڑھ کر آپ لحاف کے اندر بیچین ہو جائیں اور مزیداری بو محسوس کرنے لگیں۔ میں فرائیڈ کے نہیں مارکس کے اسکول سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہاں اس کے بعد یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پھر مجھے قلم اٹھانے کا کیا حق ہے؟۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش کیجیے خدا کی مہربانی اور حکومت کی عنایت سے بہت جلد وہ دن پھر آ سکتا ہے جب مجھ سے میرا قلم چھین لیا جائے۔ میرے ہونٹوں پر مہر لگا دی جائے اور مجھے اس زنجیر سے باندھ دیا جائے جو اونچی سیاہ زندان کی دیوار کے پیچھے میرے انتظار میں بیچینی سے دن گزار رہی ہے اور میرے ہر ساتھی سے جو اس کے پاس جاتا ہے بیقرار ہو کر پوچھا کرتی ہے "تم سب آ گئے مگر ابھی تک وہ کیوں نہیں آیا جو مجھے راتوں کو گیت اور دن کو کہانیاں سنایا کرتا تھا" میں اب بھی آپ سے یہی گزارش کروں گا کہ مجھے دو چار گالیاں دیکر رسالہ ہاتھ سے پھینک دیجئے۔ اگر آپ کو ریل کا سفر کرنا یا اپنے دل کی دھڑکن کو تسکین ہی دینا ہے تو اس کے علاوہ کچھ اور پڑھئے۔ یقین کیجئے کہ اس کے علاوہ ہر کہانی اس سے بہتر ہوگی اور پھر آپ اسے پھاڑ کر وہاں بھی بھیج سکتے ہیں جسے پڑھ کر وہ آپ کے ادبی ذوق سے متاثر ہو کر آپ سے عشق شروع کر دیگی اور اس طرح خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہو جائیگا۔

 

اس کے کانوں میں آواز آئی "میں بھوکا ہوں، خدا کے نام پر" بات کوئی ایسی نہ تھی۔ لاکھوں بار وہ یہ سن چکا تھا، مگر اس آواز سے وہ چونک پڑا، حیران رہ گیا۔ آپ حیران نہ ہو جئے، وہ اسے جانتا تھا اس لئے حیران رہ گیا۔ مگر آپ تو اس سے واقف نہیں۔ کیا لیگا؟۔ یہ انیس دو تیر کے شہر کا ایک مشہور قوال تھا۔ ایک زمانہ تھا جب شہر بھر میں اس کی آواز کی دھوم تھی۔ شہر کے بڑے بڑے رئیس اسے کافی رقم خرچ کر کے تقریب میں بلاتے تھے اور وہ وہاں اچھی اچھی طوائفوں کے رنگ کو اپنی آواز سے پھیکا کر دیتا تھا۔ اس کے گلے پر سب کو رشک تھا، چند سال بعد یہ شہر سے غائب ہو گیا۔ بمبئی کی ایک فلم کمپنی میں اس نے نوکری کر لی۔ اب ہندوستان بھر میں اس کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا جن فلموں میں یہ گاتا وہ اکثر مہینوں چلتے رہتے اور پھر چند سال بعد آج وہ ایک ظالم شہر کی ایک جگمگاتی جاگتی سڑک کے کنارے کپڑا بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اب بھی اس کا سب سے زیادہ عزیز ہارمونیم رکھا تھا جو اب کافی پرانا ہو گیا تھا۔ آواز میں وہی درد، وہی سوز وہی راگ تھا۔ مگر اب ان کا کوئی خریدار نہ تھا اور وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے لوگوں کو دیکھے بغیر سر جھکائے ہر سڑک پر سے گزرنے والے سے کہہ رہا تھا "میں بھوکا ہوں کچھ مدد کیجئے" ——— آزادی کی سب سے بڑی نشانی بھوک ہے! آگے چل کر اس نے اپنی آنکھوں سے خوب گھور گھور کر ایک ڈاکو کو دیکھا۔ اسے اپنی نظروں پر کچھ شک ہوا پھر آنکھیں مل کر اس نے غور سے دیکھا۔ یہ وہی شہر کا سب سے بڑا قزاق تھا جس کے ہاتھ خون میں رنگے تھے جس نے دوسروں کی پیاس چرائی تھی۔ جس نے روٹی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس نے منافع خوری کبھی چور بازار میں نہیں کھلے بازار میں دن کی روشنی میں سینہ تان کر کی، انسانیت زبردستی دوشیزاؤں کی عصمت کا لہو چوسا اور آج وہ حکومت کا ایک بڑا ذمہ دار افسر بنایا گیا تھا۔ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ اب اس افسر کے چارج لینے کے بعد ناانصافی نہ ہوگی وہ سر جھکائے سوچ رہا تھا کہ انصاف کا لفظ کس طرح ڈکشنری سے اڑ آیا ہے کہ پھر وہ کبھی کسی کی زبان پر نہ آئے۔ لوگ سڑک پر کھڑے خیالی گھوڑے دوڑا رہے تھے ——— سالا چور ہے..... صورت سے تو شریف معلوم ہوتا ہے...... ارے کہیں جیب کاٹی ہوگی...... صورت تو دیکھو کیسی معصوم بنائی ہے لاری کو حرکت ہوئی کچھ ہی منٹ میں وہ جیل کی جانب جانے والی ڈامر کی سیاہ سڑک کی چھاتی کو روندتی نظروں سے غائب ہو گئی۔ لوگ جو گرفتاری کے وقت اکٹھا ہوئے تھے ہنستے ہوئے ادھر ادھر چلے گئے اور وہ دھند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کامریڈ گرفتار ہو چکا تھا اور خلاء میں غبار کے چند ذرے ناچ رہے تھے، کامریڈ جو سنورنے والی دنیا کو سنوارنے اٹھا تھا دس سال تک وہ اس کے ساتھ رہا تھا مگر آج تک اس نے اس کے مرجھائے سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو نہ دیکھا تھا۔ شاید وہ

مسکراہٹ کے لئے ہی توجہ کر رہا تھا، وہ کھیتوں کی ہریالی، باغوں کی شادابی لانے کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھا
وہ پچھلی بار قید سے تپ دق کا حسین تحفہ کئی سال کی مشقت کے بعد اُسے میسر ہوا تھا۔ یہ تھا انعام جو بر شواؔ نے اسے دیا تھا
لیکن اسے شکوہ نہ تھا۔ چند منٹ کے لئے بھی کام سے مُنھ موڑنا وہ حرام تصوّر کرتا تھا۔ وہ انسان نہیں، کامریڈ نہیں ہتھوڑا
تھا۔ پچھلے ہفتے دوبار اُس کے مُنھ سے خون آیا اور آج وہ گرفتار ہوگیا۔ شاید اب وہ کبھی واپس نہ آئیگا۔ زندان کی اس دیوار
کے پیچھے نئی دنیا بسانے کے لئے شہید ہو جائیگا۔ اخباروں میں اس کا نام شائع نہ ہوگا۔ اس کی موت پر جلسے نہ ہوں گے جلوس
نہ نکلیں گے اور کل سرخ آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد نئی نسلیں اس کے نام سے واقف نہ ہونگی۔ پھر بھی وہ زندہ ہے۔
زندہ رہیگا۔ وہ کام کر رہا ہے کام کرتا رہیگا۔ طوفان پر بند کون باندھ سکتا ہے؟ ہتھوڑے کی ضرب کو کون روک سکتا ہے؟
کوئی نہیں، کوئی نہیں ———— جوانی کو روکنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے! ایک بار اُس نے ایک اڈیٹر کو گرفتار ہوتے اُس کے
اخبار کو حکومت کے حکم سے بند ہوتے اور پریس کو ضبط ہوتے دیکھا اس کا قصور یہ تھا کہ وہ حکومت پر سخت تنقید کرتا تھا۔ گھبرا کر
وہ ایک لائبریری میں گھس گیا تاکہ سپاہی کم سے کم اس کی نظروں کے سامنے ایک اڈیٹر کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ ڈالیں اور
وہ اپنی آنکھوں سے پریس کی آزادی کے مسلح سپاہیوں اور کوتوال شہر کے کندھوں پر اٹھتے ہوئے جنازے کو نہ دیکھے۔ تاکہ
اگر کبھی کوئی اس سے سوال کر بیٹھے یا خود شہر کا حاکم ہی پوچھ بیٹھے کہ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو وہ آسانی سے
یہ کہہ سکے "میں نے صرف اخباروں میں پڑھا اور لوگوں سے سنا ہے کہ تحریری آزادی ضبط ہو گئی ہے اور آپ جیسے شریف
آدمی تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ آجکل اخباروں اور لوگوں کی باتوں کا یقین کرنا مادر وطن سے غداری ہے کیونکہ روسی ایجنٹوں
نے سازش کا ایک بڑا جال بچھا رکھا ہے اور جو اخبار یہ لکھتے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ آزادی کے دشمن اور روس کے ایجنٹ
ہیں ———— بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

ایک دن اس نے ایک ایسے انسان کو دیکھا جسے نوجوان پتھر مار رہے تھے۔ اس کے کپڑے خون سے سُرخ ہو گئے تھے
گریبان چاک تھا۔ اور وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا "میں پاگل نہیں، میں پاگل نہیں ———— پاگل تم لوگ ہو۔ میں شاعر ہوں۔
———— کمینو شرم نہیں آتی ———— شرم کرو شرم ———— میں پاگل نہیں، میں پاگل نہیں ————"
قریب قریب ساری دنیا پاگل ہو چکی ہے! خانہ بدوش گھومتا پھرتا ایک قحبہ خانے پہنچا، وہاں اس نے کسبیوں کو دیکھا، ہڈیوں کے
سوکھے ڈھانچے مگر جو ریشمی کپڑوں میں لپٹے نہ تھے، پچکے زرد گال جن پر غازہ پانہ تھا۔ یہ شب کی تاریکی میں نہیں دن کی روشنی میں
قانون عدالت کے سہارے یہ خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ حکومت اور طاقت کے سہارے جہاں ڈنکے کی چوٹ پر بگل بجا بجا کر
انسانیت کو کند چھری سے ذبح کیا جا رہا تھا، زخمی انسانیت بلک رہی تھی، چمنی سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ انسان قیدیوں کی طرح
ایک بڑے پنجرے میں بند تھے۔ مشین تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔ مال تیار ہو رہا تھا اور اس بڑے قحبہ خانے میں "عصمت" سی
بہشتی چیز "محنت" بک رہی تھی۔ سونا مسکرا رہا تھا۔ اور انسان اپنا سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اُن لوگوں پر ہزار بار لعنت جو کہتے ہیں کہ
انسان نے ترقی کی ہے۔ کاش وہ بھی مصر کے اس بازار کو دیکھیں جو آج ہر صنعتی شہر میں لگا ہے اور جہاں غلام فروخت ہو رہے ہیں
ایک دن اس نے ایک اور خونی ڈرامہ دیکھا۔ یہ ایک ایسے انسان کی لاش تھی جس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ انسان ہوتے ہوئے
آرٹسٹ ہو گیا تھا۔ سماج نے کس کا جرم کب معاف کیا ہے جو اس کا جرم معاف کر دیا جاتا اور پھر ایسا سنگین جرم۔
مصور۔ کئی سال تک اس کی تصویروں میں خوب روپیہ کمایا، راجہ، مہاراجوں کے یہاں اسے مدعو کیا جاتا اور ہر
مہاراجہ کی تصویریں خوشی سے فرمائش کر کے منگائی جاتیں۔ چند سال بعد اس پر ایک جنون سوار ہوا اور اس نے
[illegible] کو اپنا مقصد بنایا۔ اپنا فن زندگی کی ترجمانی کے لئے وقف کر دیا۔ یہ مرض اسے بنگال

کے قحط کے زلزلے سے ہوا تھا۔ مصوّر اب ان ہڈیوں کے سوکھے ڈھانچوں کی تصویریں بناتا جو ایک مٹھی چاول نہ ملنے کی وجہ سے مر گئے، وہ بچے جو ماں کی گود میں دودھ کے لئے بلک رہے تھے، وہ چہرے جن پر جوانی میں ہی جھرّیاں پڑ گئی تھیں ایسی تصویریں بنا کر اس کو ایک بے پناہ مسرّت ہوتی مگر اب اسے خریدنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے اوپر ایک بیوی اور چار بچّوں کے پیٹ بھرنے کی ذمّہ داری تھی، تصویریں کمرے میں پڑی تھیں اور ہر طرف سے یہ صدا آ رہی تھی "مصوّر اگر روپیہ لینا ہے تو کوئی پتلی کمر، نرگسی آنکھیں اور ابھرے سینہ والی دوشیزہ کی تصویر بنا کر لاؤ" "قرض" اور "پیٹ" ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں مفلسی بڑھتی گئی فاقوں کی تعداد بڑھتی گئی اور غربت دن بدن اسے اپنی گرفت میں کستی رہی مگر آج وہ دنیا کی ہر گرفت سے آزاد تھا۔ اس نے سب بندھن توڑ دیئے تھے، اب اسے کوئی فکر نہ تھی۔ مصوّر نے گردن میں رسی باندھ کر خودکشی کی تھی۔ شاید آخری وقت بھی اس کے پاس زہر خریدنے کو پیسے نہ تھے۔ لاش کے ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ تھی۔ فتح کی کتنی بڑی قیمت اسے دینا پڑی تھی۔

دنیا میں کوئی چیز بغیر قیمت کے نہیں ملتی! خانہ بدوش کا کام کسی منزل پر رکنا نہیں، بس چلتے رہنا ہے آگے کی طرف جس طرح برسوں سے انسان ارتقاء کی منزل کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ اس نے پھر ایک جگہ ان انسانوں کا ایک مجمع دیکھا جن کے گریبان کھلے اور سر پھٹے تھے۔ یہ وہ ان داتا تھے جو خود بھوکے اور ننگے رہتے، مگر دوسروں کے لئے دھرتی کی سخت پتھریلی چھاتی کو چیر کر، اس سے گیہوں اور دھان پیدا کرتے، مہینوں سے شہر سے دور یہ لوگ زمیندار اور پولیس کے مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔ پچھلے ہفتہ اُن کے دو ساتھی قتل کئے گئے اور یہ اپنی فریاد لے کر میلوں پیدل چل کر قوم کے اُن رہبروں کے پاس آئے تھے جنھوں نے الکشن کے وقت ان سے کہا تھا "بھائیو! ہمیں ووٹ دو اور سوراج لو۔ ہمیں ووٹ دینا اپنے ہر دُکھ درد کو ختم کرنا ہے" یہی رہبر آج انصاف کی کرسی پر بیٹھے تھے انھیں یقین تھا کہ ان کا ہر دکھ اب مٹ جائیگا مگر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ اُن بنگلوں کے دروازوں پر پہونچے تو انھیں جواب ملا کہ وزیروں کو تم سے ملنے کی فرصت نہیں تم کچہری جاؤ اور عدالتی کارروائی کرو۔ کچہری جب یہ پہونچے تو دربان نے انھیں بتایا کہ آج حاکم کے سر میں درد ہے اس لئے وہ اجلاس پر سے چلے گئے، تم لوگ تحصیلدار کے یہاں جاؤ۔ تحصیلدار صاحب نے کہلوایا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا، تم لوگ ڈپٹی صاحب کے یہاں جاؤ۔ کسان چلتے چلتے تھک گئے تھے ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا بات ہے جو کوئی ہماری فریاد تک نہیں سنتا۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھیجا جا رہا ہے۔

غصّے میں بھرے ہوئے وہ لوگ ڈپٹی صاحب کے بنگلے پر پہونچے اور بغیر اطلاع کے وہ ایک ساتھ کمرے میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ ابھی چند منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ پولیس پہونچ گئی اور بغیر کسی نوٹس کے اس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا اور جب کسان پسپے تو گولی چلنے لگی، چند انسان گر کر تڑپے اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ مجمع منتشر ہو گیا۔

ڈپٹی صاحب کا کہنا تھا کہ یہ باغی تھے اور کسی خطرناک سازش کے سلسلہ میں یہاں آئے تھے، اس لئے امن قائم کرنے کے لئے ان لوگوں پر گولی چلانا ضروری تھا۔ کسان خون میں نہائے بڑبڑاتے گاؤں کی طرف جا رہے تھے "ہمیں دھوکہ دیا...... کہتے تھے ووٹ دو۔ سب کچھ کر دیں گے...... اور یہ بھی تو کہتے تھے کسان راج قائم کریں گے ..!.. غریب بھیا جو کر تو کہا تھا کہ رام راج بھی بنے گا...... دھوکہ دیا ہمیں اتو بنایا..... اب انھیں فرصت نہیں.... پھر کبھی گاؤں آئیں گے تو پتہ چلیگا ———— "

تعمیر کے نام پر تخریب انسان کا صدیوں پرانا کھیل ہے۔ کتب خانہ میں خانہ بدوش نے ایک پرانی نمبر دیکھنے کے لئے اخبار کی ایک فائل نکلوائی۔ اُس نے ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر جلی حرفوں میں تحریر دیکھا "پنجاب کی سرزمین سے فساد کے شعلے بھڑک اٹھے" "ڈھائی سو بچے ماں کی گود میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے"۔ "پانچسو لڑکیوں کو بے آبرو کر دیا گیا"۔ "مہاجرین کے قافلے پر حملے۔ سات سو انسان کام آئے"۔ "چلتی ٹرین سے پچاس آدمی پھینک دیئے گئے"۔ "ایک لاکھ شرنارتھیوں کا قافلہ امرتسر پہونچ گیا"

"دہلی میں فساد کی آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے" - "لاہور میں جابجا آگ کے ڈھیر" - "پچاس ہزار مہاجرین لاہور پہنچ گئے" - "آٹھ سو انسانوں کا زبردستی مذہب تبدیل کرا دیا گیا" - گھبرا کر اس نے فائل پھینک دیا اور تصویروں کی ایک میگزین اُٹھائی - میگزین کے دوسرے ہی صفحہ پر ایک بڈھے سادھو کی لاش کی تصویر تھی جس پر تین گولیوں کے نشان تھے - مرنے والا سادھو اپنی موت پر مسکرا رہا تھا - اپنی ساری زندگی سچائی اور اہنسا کا پرچار کرتا رہا، جو تھپڑ کے بدلے میں گال پیش کرنے کی تبلیغ کرتا رہا، جو ایک ملک کو تاریک غار سے نکال کر دنیا کی سب سے بڑی بلندی پر پہونچانے کی جدوجہد کرتا رہا، وہ باپ جس نے بچّوں کو پیروں پر کھڑا ہونا سکھا دیا تھا - آج اُس کو اس کے بچّوں نے قتل کر دیا - حکمرانوں کی سادھو سے غفلت اور رجعت پسندوں کی سازش کا آخری نشانہ بنا - خون کے اُن دھبّوں کو کوئی اپنے دامن سے چھڑا نہیں سکتا - دنیا پوچھ رہی ہے - سادھو پر دن دھاڑے پستول چلایا جائے اور حکومت کا اتنا بڑا لشکر سی آئی ڈی - پولیس، کوئی قوم کو یتیم ہونے سے نہ بچا سکا - سازش کا پتہ نہیں - کیسی کیسی مقدس ہستیوں کا ہاتھ تھا - امن کا سب سے بڑا پجاری، انسان کا سب سے بڑا دوست ایک اندھے تشدد کا نشانہ بن چکا تھا - ملک شرم سے سر جھکائے کھڑا تھا -

انسان کو سنوارنے اور ارتقا کی طرف لے جانے کی کوشش بھینس کے آگے بین بجانے سے کم نہیں! آخر میں جب وہ پیڑ کے ایک سائے میں ستانے کو رُک گیا تھا تو اس کی ملاقات ایک اور صاحب سے ہوئی جو دنیا میں سب سے زیادہ شریف سب سے زیادہ عقلمند سب سے زیادہ محنتی تھا - اس نے ساری زندگی اپنے مالک کی خدمت میں گذاری، طرح طرح کے تشدد اس پر ہوئے مگر اس نے کبھی زبانی احتجاج کے سوا کچھ نہ کیا - اپنی ڈیوٹی سے منھ نہ موڑا - اور ایک آجکل کے کام چور انسان ہیں ذرا سا کچھ ہوا اور ہڑتال - برسوں کی اس خدمت کا انعام مالک نے اُسے بڈھے ہونے پر نکال کر دیا - اب وہ در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا، پھر بھی اس نے مالک کے گھر پر پکٹنگ یا کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہ کیا تھا - حکومت عوام سے ایسی ہی وفاداری چاہتی تھی - اگر روٹی نہ ملنے سے مر بھی جاؤ تو شور مت مچاؤ - آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے سب کچھ کرنا ہوتا ہے - یہ سر جھکائے کھڑا تھا - خانہ بدوش سوچ رہا تھا، دھوبی کا یہ گدھا کتنا وفادار ہے ——— مثالی بھارتی بن کر ہی حکومت کا وفادار ہو سکتا ہے یا -

★ ★

ایک گنہگار ——— آوارہ صحرائی جسے سماج نے ٹھکرا دیا، جو باپ کی زندگی ہی میں یتیم ہو گیا - جسے چپہ بھر زمین بھی دم لینے کو نہیں ملتی، زندگی کی تلخی کو جو شراب کے ایک جام میں غلط نہیں کر سکتا، جس نے سب سے محبت کی مگر جس سے کسی نے آج تک شیت قدرو مروت تک بھی نہ کی، ایک ایسے دنیا کے سب سے بدنصیب خانہ بدوش انسان کے لئے جو آرٹ کو بھی نہیں سمجھتا اسے پروپیگنڈہ کے لئے استعمال کرتا ہے جو فنکار نہیں - "اشتراکیت کا ڈھنڈورچی" ہے - مجرم ہے اور وہ سب کچھ ہے جو ایک انسان کو ہونا چاہئے - اس انسان پر ہندوستان اور پاکستان دونوں حکومتوں میں ہر دروازہ بند ہے، سوائے قید خانے کے، اس پھاٹک اپنی دروازے کے جو ہر جگہ اس کے استقبال کے لئے آج بھی اس پر کھلا ہے

★ ★

یونس رمزی

سیّاح

"آپ فرانس سے آئے ہیں ؟ ———

آزاد ہندوستان میں سیاح کی حیثیت سے۔ حالانکہ محض دو صدیوں کی غلامی کے شعور پر ایک ہلکی سی دھند پھیلا دی گئی ہے بارے آپ آئے تو، ورنہ ہم اندھے ملک کے سیاہ لوگ جس قدر کریہہ ہیں آپ کے ہاں پیرنیز کے پہاڑوں پر پھیلنے والی گلیشیر ہمیشہ خندہ زن رہی ہے۔ اور واقعی ہم وحشی ہیں بھی۔ دیکھئے نا، ہم پتھر کا جگر شیشے سے تراشتے ہیں اور ہمارے ہاں انسانیت کا معیار اس درجہ ارتقائی منزل پر پہونچ چکا ہے کہ ہم وہاں سے نیچے دیکھ بھی نہیں سکتے۔

جی! تو آپ ہندوستان کے بعض اہم سیاسی نکات داد یوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ تو پہلے جان لیجئے کہ ہم میں سے ہر ایک انسان ایک عدد ہندوستانی پریس ہے۔ اور جیسا کہ آپ ہمارے فنکاروں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ کچھ تو حد درجہ تلخ کونین کا مکسچر ہیں ——— اور دوسرے کیڑوں کی طرح جنم لیتے ہوئے شعرا داد یا محض کاکلوں کے پیچ و خم سے آگے نہیں بڑھتے۔ زندگی کے پیچ و خم سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ؟ ——— اُن کی شاعری راجپوت اسکول کے ایک گاؤں کی اسپرے کے پینٹ کردہ تصویر سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور دراصل کسی شاعر کی تقدیر ایک عورت کے حسین خد و خال بچائیں پھر ظاہر ہے محترم کہ شاعری ——— !

خیر آیئے چند کام کی باتیں کروں، ——— آپ نے ٹیگور کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ بنگال کے ٹیگور جن کے بارے میں آپ سفید دیش کے انسانوں نے کالی مٹی سے جنم لیتے ہوئے لوگوں کو کہا تھا، ٹیگور کی شاعری امر ہے۔ اس کی شاعری میں وجدان روح ہے ایک شعریت، اور آپ مادی دنیا کے لوگوں نے اس کی روحانی شاعری سے مرعوب ہو کر "نوبل پرائز" دے ڈالا۔ لیکن محترم، کالی مٹی کے لوگ جس قدر کالے ہیں اُسی قدر گندے اور کریہہ۔ جو ماں کے سینے سے تاریکی چوس کر پروان چڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں انسانوں نے ٹیگور کے دیش والوں نے تاریخ کا ایک ایسا باب دہرایا ہے، اپنی شعوری قوت کا وہ منتہائے کمال دکھایا ہے جس کے ہر کردار کو ایک نوبل پرائز ملنی چاہئے۔ شانتی نکیتن کا ٹیگور جس کی وجدانی شاعری پر انقلاب کا کتنا گہرا رنگ چڑھا ہے۔ جیسے شوخیٔ خنا ——— ایک انتشار و انقلاب نے اس کی شاعری پر جیسے فتح پالی ہو۔

اور ابھی ابھی جیسا کہ آپ نے بتایا ——— آپ نے اجنتا اور ایلورا کے غاروں کو دیکھا ہے اور آپ حد درجہ متاثر ہوئے ہیں سنگی بتوں کے ہر زاویے پر سنگ تراش نے زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ لیکن محض یونہی متاثر ہوئے ہیں آپ ؟ ——— جی چونکئے مت، ہمارے ہاں اجنتا اور ایلورا کے غاروں سے ہزاروں سنگی بت آپ کو قدم قدم پر ملیں گے جو شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ پتھروں کا ڈرامہ کیا آپ نے اخباروں میں نہیں پڑھا۔ بی بی سی لندن سے خبر سنی نہیں۔ ضرور سنا ہوگا آپ نے۔ ایک منقش پتھر نے دوسرے پتھر کو پاش پاش کر دیا۔ کروکشتر اور مہابھارت کی جنگیں تو شہرت دوام رکھتی ہیں۔ لیکن حسین ساخت کے بڑے چھوٹے پتھروں کی جنگ کے بارے میں کم سنا ہوگا آپ نے ؟ ———

شاید آپ کہیں کہ انسانیت کا خون ہوا ؟ ——— اور یہ بات حد درجہ شرمناک ہے، تو کیا کیجئے گا ہماری انسانیت بہ صورت پتھروں میں جذب ہو گئی ہے اور پھر ہم تو زندہ منقش پتھر ہیں۔ ہمارا شعور ارتقائی منزلیں طے کر رہا ہے۔

کوئی فرنچ شراب نہیں گے آپ؟ ——— کم از کم بورڈو کی شرابیں تو حد درجہ مشہور ہیں پیجئے۔ ہمارے دیش میں فرانسیسی شراب، اس گلدان کے پھولوں کو نہ چھوئیے، ہمارے ہاں کے پھول بھی حد درجہ واہیات ہوتے ہیں، نہ رنگ نہ بو نہ خوشنمائی، ——— خواہ مخواہ شرمندگی ہوتی ہے، کہاں تو آپ کے اور سپین کی وادیوں میں کھلنے والے حسین پھول اور کہاں اس دیس کی بے مایہ کلیاں! ——— کبھی نہیں پینگے؟ — خیر۔ تو میں اجنتا کے غاروں کا ذکر کر رہا تھا۔ دیکھئے نا ہمارے ہاں پتھروں کی انسانیت کئی بار ٹکرائی۔ اور پھر ٹکرا جائے کیسے معلوم! — تو کیا اس کی پینٹنگ شہرت دوام حاصل نہیں کر سکتی۔ خوب یاد آیا، میری جیب میں چند تصویریں ہیں حقیقی فوٹوگراف۔ ظاہر ہے کہ کوئی صناعی یا تصنع نہیں جس پر آپ طنزیا تنقید کر سکیں۔

یہ دیکھئے پہلی تصویر، غیر منقسم ہندوستان کی ایک ننگی ماں ——— کہیئے تصویر کیسی ہے، چھاتیوں سے اس کا بچہ دودھ کی عوض خون چوس رہا ہے۔ پسند آئی یہ تصویر! ——— اگر اس کی پینٹنگ ہو تو کیا اجنتا کے بت سرنگوں نہ ہو جائیں گے، جی عریانی سے نہ گھبرائیے محترم، ہم دو صدیوں سے اس قدر عریاں رہے ہیں کہ اب ہمارے سامنے ماں، بہن، بیٹی، بیوی کی عریانی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، آپ کے یہاں پیرس کے فوٹوگرافر ہندوستان کو نیکیڈ بیوٹی البم دیتے ہیں اور ہندوستان آپ کو اجنتا اور ایلورا کے غاروں کو دکھا کر خوش کر دیتا ہے، لیکن میں آپ کو ہندوستان کی مادر زاد ننگی عورت دکھا رہا ہوں، ——— یہ دوسری تصویر جوان لڑکیوں کا رقص، ——— بالکل عریاں، ——— کیا یہ آرٹ کا دلکش نمونہ نہیں؟ آپ کے پیرس کے ڈانسنگ کلب مات ہیں ——— یہ ہمارا ہندوستانی نگار خانہ تھا! ——— ایسی جانے کتنی تصویریں آپ کو ملیں گی ——— یہ تیسری تصویر لہلہاتے ہوئے کھیت میں آگ دکھائی جا رہی ہے اور دوسری طرف منڈیر پر بچے بھوک سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں ——— کتنا بہتر آرٹ کا نمونہ ہوگا یہ، اگر مصور یا سنگ تراش، اپنی زبان اور تکنیک سے اسے ادا کرے ——— میں کہتا ہوں اجنتا اور ایلورا غاروں میں زلزلہ آ جائیگا۔ ان کی بنیادیں ہل جائیں گی ———

تو کچھ پیجئے نا ——— کم از کم کولڈ ڈرنک ہی سہی ——— وہ سامنے بیالشٹ کے بنے ہوئے "Toy Taj mahal" کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں آپ؟ ——— محترم یہ تاج محل ہمارے ہاں بڑی رومانٹک حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا ہر نقش و نگار اپنی مرمریں زبان سے شاہجہاں اور ممتاز کی محبت کے لافانی جذبوں کو زمانہ سے دہراتا آ رہا ہے، ——— مرمریں زبان، ——— جودھپور کے پتھروں سے بنا ہوا تاج، ——— ایران و ہندوستان کے فن معماری کا اعلیٰ نمونہ ——— جسے آپ کے ہاں سے آنیوالی قوم نے عجائبات دنیا میں شمار کیا ہے، ——— پھر ہم بھی تو کتنے عجیب ہیں، ——— دیکھئے، بڑے پتھروں نے چھوٹے پتھروں کو داب رکھا ہے۔ حالانکہ چھوٹے پتھر ہی بنیادیں مضبوطی پیدا کرتے ہیں۔ اب تاج کی مرمریں زبان، شان و شوکت کا تذکرہ صرف جن کو سنا سکتی ہے۔ اقلیت کی سانسیں اکھڑ چکی ہیں محترم، ——— شاہجہاں کو کیا معلوم تھا کہ اس کی قوم والے فرقہ کا لیبل لگا کر تقیہ کا لسٹ کہلائیں گے، ——— مغلوں کا تاج اقلیت کے لئے ایک چیلنج ہے، وطن پرستی کا داغ ہے، وفاداری کے راہ کا کانٹا، ——— اور اقلیت کا بس چلے تو تاج کی مرمریں زبان پر سیاہی پھیر دے، ——— بڑے پتھر نے چھوٹے پتھر کو داب رکھا ہے! ———

ہندوستانی رقص سے تو خاصی دلچسپی ہوگی آپ کو جنگلی رقص سے لیکر شنکر اور پاربتی تک، پرانی تہذیب کے گہواروں نے اس آرٹ پر اچھے نقوش چھوڑے ہیں، ——— لیکن دیر ہوئی۔ کچھ دن پہلے آتے پھر دیکھتے آپ اشوک کی بیٹیوں کا رقص، مغل اعظم شہنشاہوں کی بہنوں کا رقص، اور پھر مغربی تہذیب کا ودیعت کردہ رقص تو وہ بھی بہتر ہوا ہے جو آپ کے دیش میں ہے!

جی، یہ میپ آف انڈیا ہے اور اب دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ——— وہ دیکھئے مشرقی و مغربی کناروں پر سبز رنگ، سبز رنگ مسلمانوں کے چند عقائد کا علمبردار ہے۔ لیکن تعجب ہوگا آپ کو، اتنا گہرا سبز رنگ صرف اس لئے پھیلا دیا گیا ہے تاکہ چند دھبے

نظریۂ سکیم - باؤنڈری کی گداز منحنی لکیریں -

تعصب کی لکیریں نہیں محترم، ——— اور ان لکیروں کو، اگر آپ بالترتیب بٹھائیے تو پاکستان، ——— اور "ہم مسلمان ہیں" کا کتبہ بنجائیگا ——— اور اسی طرح ہندوستان میں بھی، ——— "ہم ہندو ہیں" کا کتبہ ——— بھلے ہم سب کچھ بھول جائیں، لیکن نقشہ کی لکیریں دونوں کے درمیان خلیج کی طرح حائل رہیں گی ——— اور بدیسی سلطنت سے آنیوالے حضرات جب میپ کی اسٹڈی کریں گے تو سخاان کی انگلیاں - ان رنگوں پر آکے رُک جائیں گی، اور اُن کے سامنے، خون، جنگ، فساد، اقلیت واکثریت کی جنگ، نام اور نسل کی جنگ، اُن کی نظروں کے سامنے آجائیگی، اور وہ مسکرا کر متنفر ہو جائیں گے!

کہئے اور کوئی موضوع بحث! ———

جی! کیا کہا؟ میں ایک ہی پہلو سے بحث کر رہا ہوں -

ہوسکتا ہے - لیکن آپ ان چیزوں کے پس منظر میں ایک نکھری ہوئی چاندنی بھی محسوس کر سکتے ہیں - ہمالہ سے لے کر راس کماری تک! ——— ہم آزاد ہیں، ——— ہم تاریکی کا سینہ چیر کر نور کے فوارے چلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، ——— آپ یہی کہلوانا چاہتے تھے، ———

تو اس سے کب انکار ہے محترم! ———

کیا کہا، ——— ہمیں ہمیشہ سے صرف رونے کی عادت ہے، بہت خوب محترم - عموماً بیوقوف ہی روتے ہیں -

"جی یہ سگرٹ تو پیجئے، ٹرکش سگریٹ، میں نے آپ کی خاطر ذرا کم مائیگی پر پردہ ڈالنے کو خرید لیا ہے، جیسے ہم ہندوستانی انگریزی بولنا شان سمجھتے ہیں -

"میں بہت بے تکلف ہوں؟ ———

جی، ہوسکتا ہے، ارے آپ مسکرائے تو، کچھ منگواؤں؟ ——— میرا مطلب شراب سے ہے -

"تو آپ ہماری، انڈسٹریز کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟" ——— تو اس کے لئے کامریڈ پرہلاد کی تصویر کافی ہے، تصویر تو حاضر نہیں، لیکن پینٹنگ کی تفہیم یاد ہے -

"ایک قومی مزدور، محنت سے چور ہے، رگ رگ سے پسینہ چھوٹ رہا ہے - پسینہ کے قطرے زمین پر آتے ہوئے خون کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور زمین پر چاندی اور سونے کے گول ٹکڑے!"

"Good Painting." ——— ظاہر ہے محترم -

لیکن آپکو ناراض ہونا تھا، اس لئے کہ آپ بھی ....

ہمیں آزادی ذہن ہے ہیں بولنے کی؟ -

لیکن اب تو ہم خود مختار ہیں ——— اور آپ صرف میرے مہمان ہیں ——— پرتاپ کے دیش کے مہمان'! -

"میں زندہ دل ہوں! بہت خوب ——— " مسکرانا تو ہم ہمیشہ سے جانتے ہیں، ہماری دیگ لمبی مسکراہٹ کا نام بھی آپ غلامی کہہ سکتے ہیں، ———

یہ ہوٹل تو بہت پسند ہوگا آپ کو؟ ——— ہونا بھی چاہئے، خالص انگلش اسٹائل کا ہے

دیکھئے آرکسٹرا اب کلائمکس پر پہونچ گیا -

رقص بھی اب شروع ہونے والا ہے -

وہ کرنجی آنکھوں والی لڑکی دیر سے آپ کو گھور رہی ہے۔ ڈوب جائیے ان آنکھوں کی گہرائی میں ——— کیجئے کوئی جدید تکنیکی رقص، ———

آپ تو فرانس سے آئے ہیں نا؟ ——— پیرس کے ڈانسنگ کلب میں تو ضرور ناچتے ہونگے۔

آپ کی ہمدم رقاصہ کتنی ساحرہ ہے، ——— لیجئے تو اب میں چلا۔

"پھر کل آؤں؟" ——— بہت خوب آج تو فرصت پا لیجئے۔

"کل آپ کی طرف سے دعوت!" ——— شاید اب آپ کی طرف سے دعوت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی! ——— دعوت تو مجھے کرنی چاہئے، ——— جی، مجھے رقص نہیں آتا ———

اور پھر ہم تو خود تھکن سے چور ہیں ——— اچھا شب بخیر! ———

بائی بائی! ———



عشق و محبت کے تصورات قدیم شاعری میں۔
ادیبوں کے لئے ڈالر کا جال۔
اس بار

جائزے

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

جاں نثار اختر

عشق و محبت کے تصورات قدیم شاعری میں

اختر — ترقی پسند شاعری کا اختر تابندہ ہے۔ اس کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوگا کہ اختر رومانی اور انقلابی نظموں کے علاوہ نہایت ہی لطیف و سادہ مگر پُر وقار اور کشش انگیز نثر بھی لکھتا ہے۔ افکار کو یہ فخر ہے کہ وہ اب اُسے ایک بلند پایہ نثر نگار اور نقاد کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے — "عشق و محبت کے تصورات" — قدیم شاعری کا ایک اجمالی خاکہ ہے۔ اس مضمون میں جگہ جگہ اختر کی نقادانہ صلاحیتیں اجاگر نظر آئیں گی۔ اس کی دوسری قسط اگلے شمارے میں پیش کی جائیگی۔

ہمیں مسرت ہے کہ جاں نثار اختر نے "افکار کی خاطر" اپنے منثور مضامین کی اشاعت کا "ایثار" بطورِ خاص گوارا کر لیا ہے۔

صہبا —

اُردو کی عشقیہ شاعری کا ایک لمحے کے لئے تصور کیجئے تو محبت کی کتنی "جگ بیتیاں" اور کتنی "آپ بیتیاں" سنائی دینے لگتی ہیں۔ عشق و محبت کے کتنے تصورات اور کتنی تاویلیں ذہن میں اُبھرنے لگتی ہیں۔ محبت کے مختلف نظریئے، مختلف پہلو اور مختلف مدارج اور اُس سے وابستہ حزن و نشاط کی صدہا کیفیات، صدہا ہلکے اور گہرے رنگ، کتنے اندھیرے اور اُجالے دھوپ چھاؤں بن کر دل و دماغ پر چھانے لگتے ہیں۔ ہمیں اپنی عاشقانہ شاعری کی وسیع دنیا میں کیا نہیں ملتا۔ یہاں خدا کی محبت بھی ہے اور بتوں کی پرستش بھی، یہاں روحانی یا سرمدی عینیت (Ideal) کی طلب بھی ہے اور جسمانی حُسن کی کشش بھی۔ مرد کی عورت سے اور عورت کی مرد کی جنسی محبت بھی ہے اور ہم جنسانہ لگاؤ بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مصحفی نے یہ شعر ہمارے اُردو شعراء کے لئے کہا تھا ؎

صفحۂ روزگار پر لکھ لکھ عشق کی داستان چھوڑ گئے

آیئے اس ذخیرے پر ایک سرسری نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ عشق و محبت کے کیا کیا تصورات ہمیں ملتے ہیں۔ اُردو شاعری کا خمیر ہی عشق و محبت کے جذبات سے ہوا ہے۔ اُردو کی داغ بیل کے زمانے میں ہمیں امیر خسرو کے ریختے میں ہندی شاعری کی روایات رچی ہوئی ملتی ہیں۔ "پیا کو دیکھے بغیر اندھیری رتیاں" نہ کٹنے کی شکایت کتنی رنگین ہے۔ عورت کی طرف سے یہ اظہارِ عشق ہندی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے۔ دکنی شعراء میں قلی قطب شاہ نے بھی اس طرزِ محبت کو اپنایا ہے اور "پیا بن سکھی ری جیا جائے نا" کی میٹھی کسک محسوس کی ہے۔

شمالی ہند کے اوّلین شعراء میں افضل کی ایک طویل عاشقانہ مثنوی ملتی ہے جس میں اُس نے ایک ہندو عورت سے اپنے عشق کا قصہ دہرایا ہے۔ یہ اُردو شاعری میں مرد اور عورت کی پہلی داستانِ عشق ہے۔ افضل اُس کافر ادا کو پانے کے لئے ہر جتن کرتا ہے۔ دل کے ہاتھوں مجبور افضل تبدیلِ مذہب بھی کر بیٹھتا ہے۔ میر کا یہ شعر گویا اس کی ترجمانی کرتا ہے ؎

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

افضل عشق کا صحت مند تصور رکھتا ہے، وہ اپنی محبت میں کامیاب ہے، لیکن قزلباش امید کو 'بامن کی بیٹی' کی گالیاں ہی کھانے کو ملتی رہیں۔

دکن کے قدیم سرمایہ میں ہمیں صدہا عشق و محبت کی رنگ رنگیلی داستانیں ملتی ہیں، لیکن یہ دکنی شعراء کی آپ بیتیاں نہیں جگ بیتیاں ہیں۔ منوہر کنور اور مدھو مالتی، سیف الملوک اور بدیع الجمال، بہرام اور گل اندام، کام روپ اور کلا، رضوان شاہ اور روح افزا پری، ملاّی اور شہزادی گوہر، یہ اور کتنے ہیرو اور ہیروئن دکن کی مثنویوں میں ملتے ہیں، ان میں بعض ترجمے یا خیالی قصے بھی ہیں۔ رضوان شاہ کی روح افزا پری سے محبت یا کام روپ کا خواب میں کلا پر عاشق ہونا بعید از قیاس ہے، لیکن اگر ہم ان فوق الفطری عناصر کو نظر انداز کر کے دیکھیں تو عشق و حسن کے جو مرقعے فائز اور تحسین نے پیش کئے ہیں اُن میں واقعیت کی پوری شان پائی جاتی ہے۔ نصرتی کی گلشن عشق اور ابن نشاطی کی پھول بن اسی طرح کی تخلیقات ہیں۔ عام طور پر عشق و محبت کا جو تصور ان مثنویوں میں ملتا ہے وہ مرد و عورت کی باہمی توانا اور تندرست محبت ہے۔ عاشق اپنی محبوبہ کو اور محبوبہ اپنے عاشق کو چاہتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی محبت کو کامیاب بنانے کے لئے سیکڑوں بلاؤں اور آفتوں کا سامنا کرتے ہیں اور بالآخر کار ایک دوسرے کو پا لیتے ہیں۔ محبت ازدواج کی پُرمسرت زندگی بن جاتی ہے۔ ان کے نزدیک محبت کی تکمیل ازدواج سے ہوتی ہے وہ محبت کا سیدھا سادا اور صحت مند تصور رکھتے تھے اور محبت کے بارے میں خواہ مخواہ کے ذہنی مرکبات (Complexes) کا شکار نہ تھے۔ اس دور کی غزلیات میں بھی محبت کا یہی سیدھا سادا تخیل پایا جاتا ہے جس میں عاشق اپنی محبوبہ سے ذہنی اور جسمانی قرب کی خواہش رکھتا ہے۔ قلی قطب شاہ نے اپنے کلام میں بھاگ متی اور اپنی دوسری بیگموں کے حسن و شباب کا بھی رنگ بھرا ہے اور یہ رنگ خاصا شوخ ہے۔

اس دور کی شاعری میں صوفیانہ عشق کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں، لیکن یہ حیرت کی بات نہیں۔ اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اُردو کی ابتداء اور تصوف کی اشاعت ساتھ ساتھ ہوئی۔ تصوف کو اُس وقت ایک زندہ تحریک کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ شاعری میں اس کا سما جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ قطب شاہ، محمود بحری، خواجہ حسن، وجدی اور سراج کے کلام میں یہ رنگ زیادہ گہرا اور واضح ہے۔ ولی دکنی کی غزل میں بھی صوفیانہ خیالات ملتے ہیں، لیکن عشق و محبت کا جو تصور اُن کے کلام میں رچا ہوا ہے وہ قطعاً مجازی ہے۔ ابتداءً اس مجازی عشق میں ہندی شاعری کے اثرات گھلے ملے نظر آتے ہیں، لیکن ولی کی بعد کی شاعری نے فارسی شاعری کے اثرات کو قبول کیا۔ چنانچہ ایک طرف مرد اور عورت کی باہمی عشق و محبت کے جذبات ملتے ہیں تو دوسری طرف امرد پرستانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اس قسم کے جذبات کے اظہار کی جرأت دکنی میں فارسی شاعری کے اثر سے پیدا ہوئی۔ لیکن ولی کی شاعری میں یہ رجحان محض روایتی نہیں۔ اُس کے کلام میں ہمیں اُن لڑکوں کے نام تک ملتے ہیں جو اُس کے محبوب رہے ہیں۔

شمالی ہند کے قدیم شعراء میں بھی صوفیانہ اور عاشقانہ خیالات پائے جاتے ہیں، جہاں تک صوفیانہ خیالات کا دخل ہے اُس کی ذمہ دار وہی تصوف کی بڑھتی ہوئی تحریک تھی، پیری و مریدی کے بازار گرم تھے۔ دوسرے یہ شعراء دکنی شاعروں کی بہ نسبت فارسی شاعری سے زیادہ متاثر تھے اور فارسی کے شعراء متاخرین کا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لئے تصوف کا رنگ اور بھی ان کے کلام میں آیا۔ اس کے باوجود مجازی عشق کی لے صاف سنائی دیتی ہے۔ شاہ مبارک آبرو نے تصوف نگاری کے باوجود ایک مثنوی "آرائش معشوق" لکھی جو اب نایاب ہے۔ لیکن اس کے نام سے ہی آبرو کے عاشقانہ رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ حاتم کی غزلیات میں بھی عاشقانہ رنگ غالب ہے۔ تاباں جنھیں میر نے "معشوق عاشق مزاج" کے لقب سے یاد کیا ہے اور جو مرزا مظہر جانجاناں کے محبوب اور خود بھی اوائل جوانی میں ایک خوش رو نوجوان سلیمان کے عاشق تھے اُنکی شاعری کا تنہا موضوع عشق اور بالخصوص حرمان عشق ہی تھا۔ تاباں اپنے عشق میں ناکام رہے اور اسی لئے اُن کے کلام میں ایک سرگشتگی اور ایک دل بستگی پائی جاتی ہے۔ اس دور کے دوسرے شعراء میں بھی عاشقانہ جذبات نظر آتے ہیں۔ لیکن ایہام گوئی نے اُنھیں بالعموم مصنوعی اور غیر حقیقی بنا دیا ہے۔

متوسطین کے دور میں فارسی شاعری پورے طور پر اُردو شاعری پر چھا چکی تھی اور عشق و محبت کے وہ تمام مضامین جو فارسی ادب میں تھے اُردو میں منتقل ہو گئے تھے۔ محبوب کی بے اعتنائی اور بیوفائی، اُس کی رقیب نوازی، عاشق کا صبر و تحمل، رشک و رقابت، اُس کی کوچہ گردی اور صحرا نوردی، وحشت اور جنون کی کیفیات، محبوب کا کبھی خنجر بکف ہونا اور کبھی عاشق نوازی کرنا، عاشق کا اپنے ہمدردوں سے سنگ آستاں کو گھس ڈالنا، رقیب کے کوچے میں عاشق کا سر کے بل جانا، محبوب کا مزار عاشق کو پامال کرنا اور عاشق کا قبر میں فریاد کرنا ـــــــــ یہ اور سیکڑوں عشق و عاشقی

کے مضامین اردو میں جگہ پا چکے تھے جن کو محض رسمی اور تقلیدی طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا۔ لیکن اس دور کے بڑے اور حقیقی شاعر محض فارسی ادب کی روایات میں کھو کر نہیں رہ گئے تھے۔ انھوں نے فارسی سے اظہار بیان کے سانچے لئے مگر ان میں اپنے دل کا سوز و گداز ڈھال دیا۔ میر رسمی طرز اظہار سے بھی کرتا ہے۔ اس کے تخیل اور اظہار میں انفرادیت ہے، وہ اپنا درد و غم نہایت نرم اور پگھلے ہوئے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ میر کے یہاں فرہاد، لیلیٰ اور قیس کی تلمیحات اس کے کلام میں بھی آتی ہیں جن کو اردو شاعری نے مثالی عاشق و معشوق قرار دے لیا تھا، لیکن اسے اپنے عشق کا پندار ہے۔

مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا۔

میر کی شاعری سراپا سوز عشق نظر آتی ہے۔ اس کے یہاں جو سوز و گداز، جوشتگی، دل گرفتگی، جو سپردگی اور شکستگی پائی جاتی ہے وہ محبت اور محبت کی جگر سوزی اور دل خراشی کے ذاتی تجربے کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ کہتا ہے ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے　　درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

"تذکرۂ بے خزاں" میں میرؔ کے عشق کی داستان ملتی ہے۔ میرؔ اکبر آباد میں ایک "پری تمثال" جو اس کی عزیز بھی ہوتی تھی شدید عشق کرتا تھا۔ رسوائی اور بدنامی تک نوبت پہونچی اور میرؔ کو دیار حبیب کو خیرباد کہنا پڑا۔ تمام عمر عشق کی دیوانگی سر سے نہ گئی۔ میرؔ ایک عرصہ تک فی الواقعی جنون کا شکار رہا، چنانچہ اس نے اپنی مثنوی خواب و خیال میں اس داستان جنون کو دہرایا ہے۔ اس عہد جنون میں میرؔ کو چاند میں ایک صورت نظر آتی تھی وہ "چہرۂ مہتابی" یقیناً اس پری تمثال کا تھا جس سے میرؔ کو عمر بھر "میل خاطر" رہا۔ میرؔ کی روداد عشق ایک شعر میں اسی کی زبانی سنئے ؎

دل گیا، رسوا ہوئے، آخر کو سودا ہو گیا

اس دو روزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہو گیا

چنانچہ میرؔ کے یہاں محبت کا تصور اسی حرمان عشق کے تجربہ پر مبنی ہے۔ لیکن میرؔ کے کلام میں جب ہم دلّی کے کج کلاہ لڑکوں کا ذکر دیکھتے ہیں تو سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کہیں یہ عشق کی ناکامی کا ردّ عمل تو نہیں۔ میرؔ کی چھ عاشقانہ مثنویاں ہیں جن میں خواب و خیال سب سے اہم ہے۔

سوداؔ اور اس کے دور کے تمام شعراء کے عشق کا تصور عموماً مجازی ہے۔ سوداؔ عشق کے غم میں گھلتا نہیں جاتا بلکہ اس کے احساس عشق میں کسی حد تک طرب پسندی شامل ہے۔ مجازی عشق کے بہت سے مروجہ خیالات کو بھی سوداؔ نے اپنے اشعار میں دہرایا ہے، لیکن اپنی شوکت بیان سے ان کو بنا سنوار دیا ہے۔ مرزا مظہرؔ جانجاناں اور خواجہ میر دردؔ کی عملی زندگی صوفیانہ اور درویشانہ تھی۔ اس کا اثر ایک حد تک ان کی شاعری پر بھی پڑا اور ان کے کلام میں صوفیانہ عشق کی جھلکیاں بھی شامل ہو گئیں۔ لیکن ان دونوں کے بہترین اشعار تصوف کے نہیں بلکہ خالص عشقیہ اشعار ہیں، جن میں مجازی عشق کا تصور کار فرما ہے۔ مرزا مظہرؔ اور میر دردؔ کبھی عشق مجازی کو عشق حقیقی کا ذریعہ بھی سمجھنے لگتے ہیں جو ان کے صوفیانہ مسلک کا نتیجہ ہے۔ میر اثرؔ کی زندگی بھی فقر و تصوف کی تھی، لیکن صوفیانہ اثر اس کے کلام میں تقریباً نقدان ہے۔ عشق مجازی اس کا موضوع ہے۔

دیوان اثرؔ اور مثنوی خواب و خیال اس کی یادگار ہیں۔ اگرچہ اثرؔ نے اعتراف نہیں کیا، مگر مثنوی کا طرز غمازی کرتا ہے کہ اثرؔ کسی بت نا شناسا کے پرستار تھے۔ یہ کوئی عورت تھی جس سے ابتداً اثرؔ کو نشاط وصل حاصل رہا، لیکن بعد میں محبوب نے ترک مراسم کیا اور اثرؔ کو دل سے بھلا دیا، اثرؔ اس کو نہ بھول سکا۔ یہ بات کچھ کم دلچسپ نہیں کہ اثرؔ عشق کے بارے میں لکھتے لکھتے، جیسے چونک سا جاتا ہے، اسے اپنا صوفی اور درویش ہونا یاد آجاتا ہے اور وہ مجازی عشق کی برائی اور حقیقی عشق کی تعریف پر اتر آتا ہے۔ اس دور میں ہمیں اور بھی اچھے شاعر ملتے ہیں ——— قائمؔ، یقینؔ، بیدارؔ۔ ان سب میں ہم وہی عشق کا مجازی تصور پاتے ہیں۔ قائمؔ اثرؔ کی طرح تلخ نوا نہیں، بلکہ اس کے برخلاف اس کے کلام میں ضبط اور سنجیدگی کا پہلو ملتا ہے۔ جواں مرگ یقینؔ کے کلام میں عشق کی گرمی اور شورش موجود ہے۔ بیدارؔ کا رنگ اگرچہ تقلیدی ہے، لیکن اس تقلیدی رنگ میں بھی جذبات کی لطافت اور گداختگی سموئی ہوئی ہے۔

نظیرؔ کی شاعری کا دور بھی یہی ہے، لیکن وہ اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے، اس کے یہاں دوسری دنیا نظر آتی ہے، جو بہت کشادہ اور دیسی ہے۔ نظیرؔ عشق کا نشاطیہ تصور رکھتا ہے۔ اس کا یہ تصور اگرچہ جنسی استلذاذ پر مبنی ہے، لیکن وہ اس جنسی لذت میں مستغرق نظر نہیں آتا، جنسی خواہش

اُس کے دل و دماغ پر چھا کر نہیں رہ جاتیں - بلکہ اس کیف و نشاط میں بھی ایک ہلکا پھلکا انداز ہے - یہی سبب ہے کہ اُس کے عاشقانہ کلام کا مطالعہ جاسے ذہن کو ایک لمحہ کے لئے بھی بوجھل نہیں کرتا - اُس کی اس نشاط پسندی میں کوئی گھٹن نہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نظیر فطرت کے مناظر اور ان کی رنگینیوں کو اپنی عیش و عشرت کی دنیا میں سمیٹ لیتا ہے - اُس کے حسیات عشق میں البتہ سطحیت پائی جاتی ہے - نظیر کا دل حرمانِ عشق سے آگاہ نہیں، وہ غم کا احساس نہیں رکھتا - نظیر کی محبوبہ موتی میں بھی وہی چہل بل، وہی چلبلاہٹ اور وہی البیلا پن ملتا ہے جو نظیر کے من کو موہ لینے والا ہے لیکن نظیر موتی سے ہی پیمان وفا باندھے ہوئے نہیں ہے ——— اور بھی کتنی "شاہدانِ بازاری" اُس کی نظموں کی آڑ سے جھانکتی نظر آتی ہیں - بہرکیف نظیر کے کلام میں لمیاتی احساسات کی زندہ اور دلکش تصویریں ضرور ملتی ہیں -

مصحفی، اُردو شاعری کے دو اسکولوں کو ملاتا ہے اس لئے اُس کے کلام میں دونوں رنگ موجود ہیں - ایک طرف میر و درد جیسے استادوں کا اثر اس کی شاعری میں سمویا ہوا ہے جو خالص تغزل یا داخلیت ہے، اور دوسری طرف اُس کے کلام میں وہ تکلف اور ظاہری سجاوٹ ہے، وہ خارجیت ہے جو انشاء، جرأت اور رنگین کے اثر سے پھیل رہی تھی - مصحفی اس رنگ سے متاثر ضرور ہوا لیکن پھر بھی اپنے کو بہت کچھ بچائے رہا - اُس کی وہی عاشقانہ شاعری اہمیت رکھتی ہے جس میں میر اور درد کا رنگ جھلکتا ہے ——— اور جس میں عاشقانہ انفعال اور خود گذاشتگی کی کیفیت پائی جاتی ہے - اسی عاشقانہ شاعری سے اُس کے عشق کا تصور متعین ہوتا ہے - البتہ اُس کے کلام میں میر کا سا جذب غم نہیں - مصحفی نے میر کی مثنوی ——— "دریائے عشق" کے جواب میں ایک عشقیہ مثنوی "بحر المحبت" بھی لکھی ہے جو اپنے رنگ میں کامیاب ہے - اس دور میں اور بھی مثنویاں لکھی گئی ہیں - لیکن میر حسن کی "سحر البیان" سب عاشقانہ مثنویوں کا ماحصل ہے - یہ شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے عشق کا افسانہ ہے - میر حسن نے اس افسانہ کی تعمیر و ترکیب میں فوق الفطری عناصر کو بھی شامل کیا ہے اور ماہ رُخ پری اور فیروز شاہ جن بھی اس قصہ کے کردار ہیں - جہاں تک عشق و محبت کے تصور کا تعلق ہے ——— اس مثنوی میں وہی تصور ہے جو اُس وقت لکھنؤ کی سوسائٹی میں رس بس گیا تھا - بے نظیر اور بدر منیر پہلی ہی ملاقات میں شراب اور شراب وصل سے سرشار ہوتے ہیں ——— یہ کیا ہے؟ وہی لکھنؤ کی عیش پرست فضا کا اثر جس نے محبت کو جسمانی خواہشات کی تکمیل کے مرادف قرار دیدیا تھا - اس زمانہ میں ایک مثنوی اور بھی قابل ذکر ہے اور وہ محبت کی "اسرار محبت" ہے - لیکن یہ قصہ اُس کی ذہنی تخلیق نہیں - یہ سسی اور پنوں کی داستانِ عشق ہے - سندھ اور جھنگ کے ہیرو، ہیروئن کا المیہ ہے - غالباً المیہ ہونے کے باعث ہی یہ مثنوی اُس نشاطیہ دور میں مقبول و معروف نہ ہو سکی - اُس فضا میں وہی شاعری مقبول ہو سکتی تھی جو جنسی جذبات میں ہیجان برپا کر سکتی -

اُردو شاعری کو نوابوں اور رئیسوں کی سرپرستی حاصل ہو چکی تھی - لکھنؤ کے عیاش امراء اور رؤسا کے مذاق و اثر سے شاعری میں بھی عیاشانہ جذبات جگہ پا گئے تھے اور عشق و عاشقی کے لطیف و پاکیزہ تخیلات و جذبات کے بدلے مبتذل مضامین اور سوقیانہ خیالات کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا تھا -

جرأت، انشاء اور رنگین کا اس میں خاص حصہ ہے - جرأت ادا بندی اور معاملاتِ عشق کی شاعری کا بانی ہے اُس کے عشق کا تصور خالص جسمانی اور نفسانی ہے - "چمپئی رنگ" اور "گدرایا ہوا جوبن" اُس کا مقصودِ عشق ہے - جرأت نے ایک مثنوی بھی حسن و عشق لکھی جو ایک بزرگ خواجہ حسن اور لکھنؤ کی بخشی طوائف کا قصہ ہے جس میں سطحی اور عامیانہ جذبات کی بہتات ہے - انشاء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خاں کی صحبت نے اُس کی شاعری کو بگاڑا ——— لیکن اس میں خود اُس کی افتادِ طبع کا بھی کچھ کم دخل نہیں ——— لکھنؤ کی عیش پرست فضا میں ہر قسم کی جنسی کمزوریاں عام ہو گئی تھیں، چنانچہ انشاء کا سعادت علیخاں کے ڈیرے میں چند "طفل پریزاد" کا ذکر خالی از علت نہیں - یہی جنسی مریضانہ ذہنیت تھی جس نے انشاء سے "چنچل پیاری ہتھنی" کی شادی کے بیان میں ایک مثنوی لکھوائی ——— حد تو یہ ہے کہ انشاء اُردو شاعری کے عروض کو بھی اسی رنگ میں رنگ دینا چاہتا تھا - اُس نے دریائے لطافت میں بحروں کے جو ارکان تجویز کئے ہیں وہ مفاعیلن کے بجائے "پری خانم" اور مفعول مفاعیلن کے بجائے "بی جان پری خانم" قسم کے ہیں - پھر ریختی کو اُس نے اپنا خاص فن بنایا جو اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا بہترین آئینہ ہے - رنگین بھی اسم بامسمّٰی ہے، یہی رنگ اُس پر چھایا ہوا ہے - یہی نفسانی جذبات اُس کی شاعری کا بھی موضوع ہیں - ایک "مثنوی دلپذیر" لکھی ہے، جس میں شہزادہ ماہ جبیں اور رانی سرینگر کا قصہ ہے - اُس کی اور بھی مثنویاں ہیں، لیکن ایجادِ رنگیں میں رنگین کھل کھیلے ہیں اور عورتوں کے

اور عورتوں کے ہم جنسانہ فعل پر بھی ایک نظم لکھ ڈالی۔ ایک دیوان ریختی میں بھی موجود ہے اور اگرچہ بدچلن عورتوں کو "عروس شیطان" کہتا ہے لیکن انھیں کے دام محبت کا اسیر ہے اور اسی محبت کو ذہنی طور پر سراہتا بھی ہے۔

ناسخ نے جس اسکول کی ابتدا کی اُس میں بھی داخلی جذبات کے بجائے وہی خارجیت موجود ہے۔ البتہ اُس میں ادا بندی اور معاملہ بندی کا وہ رنگ نہیں۔ بلکہ خیال بندی اور تناسب لفظی پر زور صرف کیا گیا ہے۔ ناسخ اور ناسخ کے شاگردوں کی شاعری بے روح الفاظ کی بازیگری ہے محبت اور جذبات کے حسین شعلے تو کہاں، اُن کے کلام میں تو جرأت اور انشاء کی دہکتی ہوئی نفسانی آگ بھی بجھی بجھی سی محسوس ہوتی ہے۔ آتش کے یہاں ناسخ کا سا انقباض نہیں پایا جاتا۔ اُس کے یہاں صوفیانہ عشق بھی ہے اور محبت کے جیتے جاگتے احساسات بھی۔ اگرچہ وہ لکھنوی اثرات سے بچا ہوا نہیں پھر بھی عشق و محبت کا وہ مبتذل تصور اُس کی شاعری میں جو اُس دور کی خصوصیت ہو کر رہ گیا تھا۔ آتش کے مشہور شاگرد نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" اس دور کی عشقیہ شاعری کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ تاج الملوک اور بکاؤلی کے عشق کا افسانہ ہے، یہ قصہ نسیم کا اپنا تصنیف کیا ہوا نہیں ہے لیکن نسیم کا اس قصہ کو منظوم کرنے کے لئے منتخب کرنا اُس کے ذہنی رجحان پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس افسانہ کا ہیرو تاج الملوک اگرچہ بذات خود بکاؤلی سے محبت کرتا ہے، لیکن دلبر بیسوا، محمودہ اور چترا وت سے بھی اُس کا جنسی تعلق ہے اور پھر بکاؤلی کے ساتھ یہ تینوں عورتیں بھی "گلشن نگارین" میں اُس کی چہیتی بیویاں بنکر رہتی ہیں، یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک مرد ایک عورت سے محبت کرتے ہوئے دوسری عورتوں سے بھی جنسی لگاؤ رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کا جواب ہم نسیم سے طلب نہیں کر سکتے۔ اس دور میں حاتم علی بیگ مہر کی مثنوی "شعاع مہر" بھی آتی ہے جو بڑی حد تک لکھنوی اثرات سے پاک ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں اس مثنوی کی بہت تعریف کی ہے۔

لکھنؤ کی یہ تعیش پسند فضا واجد علی شاہ اختر کے عہد حکومت میں اور بھی چمک اُٹھی۔ جان عالم پیا جی کھول کر دادِ عیش دے رہے تھے خزانہ اور ماہ پیکر کے رہس، سبز پری اور گلفام کے سوانگ، پریوں کے گانے اور گھونگٹ والیوں کے ناچ اور ترت سے قیصر باغ کی فضا گونجی ہوئی تھی۔ خاص و عام سب اسی رنگ میں سرشار تھے۔ شعر و سخن کی صحبتیں عام تھیں۔ خود واجد علی شاہ نے مختلف دیوان لکھے۔ "دریائے تعشق" ایک عاشقانہ مثنوی بھی ——— ایک اور مثنوی میں اُس نے اُن محلات کا ذکر کیا ہے جن سے عقد یا متعہ کیا۔ اختر کی دریائے تعشق ہو یا تق کی طلسم الفت، اس دور کی شاعری میں محبت کے تصور پر خالص عضویاتی رنگ غالب تھا اور عورت کی حیثیت "مرد کے بستر کی زینت" کے سوا کچھ نہ تھی۔ طلسم الفت کی ہیروئن شہزادی عالم آرا کو دیکھئے تو ایک بیسوا کا تصور سامنے آتا ہے۔ امانت کی واسوخت بھی اس دور کی عیاشانہ ذہنیت کی پوری طرح نمائندگی کرتی ہے۔ اُس کے مشہور ڈرامہ اندر سبھا کی فضا بھی اگرچہ یہی ہے، لیکن سبز پری کا کردار جذبات عشق کے اعتبار سے قابل لحاظ ہے۔ سبز پری، گلفام کی محبت میں کیا کچھ نہیں جھیلتی۔ وہ محبت و خلوص، صبر و تحمل اور استقامت و ایثار کی زندہ تصویر ہے۔ امانت غالباً محبت کی اعلیٰ قدروں کا احساس رکھتا تھا۔ لیکن اُسے اپنے ماحول میں ایسی محبت کی مثالیں نہیں مل سکتی تھیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ بجائے کسی انسانی پیکر کے ایک پریزاد میں ان اعلیٰ صفات کو دکھاتا ہے۔ واجد علی شاہ کے آخری زمانہ میں شوق لکھنوی کی عشقیہ مثنویاں بھی عیش کوشی کی داستانیں ہیں۔ بہار عشق کی ہیروئن ماہ لقا محض اپنے عاشقوں کے بلاوے پر جسے اُس نے نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کوئی ذہنی وابستگی ہے اُس کے گھر پہونچتی ہے۔ اور خود کو اُس کے بوالہوسانہ آغوش کے سپرد کر دیتی ہے۔ ماہ لقا اُس ہوست پرست سوسائٹی کی نمائندہ لڑکی ہے جو ذہنی طور پر بالکل مسخ ہو چکی تھی۔ ایک لڑکی غالباً اس قسم کا اقدام اُسی وقت کر سکتی ہے جب جنسی خواہشات اُس کے ذہن پر اس درجہ غلبہ آ چکی ہوں کہ عصمت اور پاکدامانی اُس کے لئے غیر اہم ہو جائے۔ ماہ لقا پر اپنی اس لغزش کا کوئی خاص ردعمل نہیں ہوتا۔ اُس کا ذہن اگر احتجاج کرتا ہے تو محض اس بنا پر کہ افشائے راز سے جگ ہنسائی کا امکان ہے۔ شوق کی لذت عشق اور فریب عشق اس اعتبار سے اور بھی گئی گذری ہیں۔ فریب عشق میں تو نواب مرزا خود ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کی ہیروشپ کیا ہے ——— ؟ محض نفس پرستی اور عیاشی۔ زہر عشق میں بھی اگرچہ ہیرو ہی جنسی رجحان ملتا ہے۔ لیکن مہ جبین کی محبت میں اُس کے دل کا گداز شامل ہے۔ اُس کے کردار میں والہانہ شیفتگی اور خود گذاشتگی کا وہ عنصر ہے جو اُس کو اس دور کی ہر مثنوی کی ہیروئن سے بلند کر دیتا ہے۔ محبت کے لئے سب کچھ نثار دینے کا جذبہ اس میں موجود ہے۔ وہ اپنی جان تک کی قربانی دیتی ہے۔ زہر عشق کا مطالعہ ہم میں کوئی جنسی ہیجان یا لذت کا احساس

پیدا نہیں کرتا۔ اُس کی حزنیہ فضا اور اُس سے زیادہ مہ جبیں کے دل کی لگن ہمیں متاثر کرتی ہے۔ یہ ضرور ہے مہ جبیں کی خودکشی کسی صحت مند ذہنیت کا نتیجہ نہیں کہی جا سکتی

لکھنؤ کے اس دور کے مقابلہ میں دہلی کی شاعری کا ہمیں کھلی ہوئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ دہلی کے شعرا میں خارجیت کے بجائے داخلی جذبات و کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ شاہ نصیر کو تو خیر "دہلی کا ناسخ" کہا گیا ہے لیکن ذوق کے کلام میں بھی ایسی گہری کیفیات یا لطیف احساسات نہیں ملتے۔ اُن کی شاعری کی محرک عشق و محبت نہیں بلکہ خود زبان کے محرکات ہیں۔ ذوق نے اگرچہ عشق "دعوئ مندہ" کے ساتھ کیا ہے اور "صفحۂ دل پر" "صد مہر داغ عشق" بھی پیش کئے ہیں، لیکن یہ محض رسمی ہے اور خود اسی کا مصرع "یہ بھی ہوگا کہ شہیدوں میں مل گیا" اُس پر صادق آتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس کے کلام میں مجازی حسن و عشق پر مروجہ خیالات کے حامل بہت سے اچھے شعر ملتے ہیں۔ بعض اشعار میں اگر اصلیت اور واقعیت کا ہلکا سا رنگ پیدا ہو گیا ہے تو یہ محض اُس کی غیر معمولی قدرت بیان ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے اوائل شباب کی شاعری میں جرأت کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن اُس کے تصور عشق جرأت کے عشق و محبت کے مبتذل تصور سے کوئی واسطہ نہیں۔ اُس کا دل و دماغ شائستہ اور تربیت یافتہ ہے۔ دہلی کی فضا لکھنؤ کی فضا نہ تھی اور نہ لال قلعہ کا ماحول قیصر باغ کا ماحول تھا۔ اُس کے ابتدائی کلام میں شوخ رنگینی، ادا بندی اور معاملہ بندی ضرور ہے۔ لیکن یہ رنگینی عشرت پرستوں کی ممنون نہیں۔ خود اس کی جوانی کی رنگینی ہے۔ ظفر کی بعد کی شاعری میں جو غم ملتا ہے وہ "غم دوراں" ہی ہے، لیکن اُس نے "غم دوراں" کو "غم جاناں" بنا دیا ہے۔ عشق و محبت کے جذبات، غم کی آنچ سے تپ کر نکھر گئے ہیں۔ اور اُس کے عشق کے تصور میں احساس غم بھی شامل ہو گیا ہے۔ البتہ مومن کی شاعری خالص عشقیہ شاعری ہے۔ وہ محبت کا روحانی تصور نہیں رکھتا۔ محبت کو اسی مادی دنیا کی شے سے وابستہ سمجھتا ہے۔ خود محبت کو برتتا ہے۔ اور اُس کا ذاتی تجربہ رکھتا ہے۔ اُس کی محبوبہ صاحب جی ہر طرح اُس کے عشق کی پذیرائی کرتی ہے اور اگرچہ وہ کچھ دنوں بعد اپنے وطن لکھنؤ چلی جاتی ہے۔ لیکن مومن کے دل میں اپنی محبت کے گہرے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ مومن کی مثنوی "قول غمیں" اور مرثیہ "محبوبۂ حور شمائل" صاحب جی سے ہی متعلق ہے لیکن مومن کی زندگی محض اس رومان کی پابند ہو کر نہیں رہی۔ اس کی دوسری مثنویاں بھی بالعموم اس کی ذاتی وارداتیں ہیں۔ اُس کی شاعری واردات اور معاملات کی شاعری ہے لیکن وہ بھی محبت کے بارے میں جرأت کی سی ذہنیت نہیں رکھتا۔ اور اگرچہ اُس کے یہاں محبت کا تصور ذات پرستی پر قائم ہے لیکن اُس میں ہم ضبط کا احساس بھی پاتے ہیں اور اسی سے مومن کی شاعری میں بیان کی وہ تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی ہے جسے مصنف "شعر الہند" نے "دلی کی متانت" کہا ہے۔ پھر بھی بعض تضمینوں اور مثنویوں میں مومن لذت پرستی میں ڈوب گیا ہے۔

ہمارے تقریباً تمام شعرا میں محبت کا شعور محدود ہے۔ لیکن غالب کے یہاں عشق و محبت کا شعور ہمہ گیر ہے۔ اس میں وسعت بھی ہے۔ تنوع بھی ہے۔ اُس کی عشقیہ شاعری میں ہمیں تجربہ بھی ملتا ہے اور تجزیہ بھی۔ اس کے یہاں جذبہ بھی ہے اور ذہن بھی۔ دل کی سادگی بھی ہے اور عقل کی پرکاری بھی۔ غالب نے عشق کا گرم و سرد دیکھا ہے۔ "ایک ستم پیشہ ڈومنی" نے اس زندگی میں عشق کا رنگ بھرا۔ اس رنگ میں نشاط کا رنگ اتنا گہرا نہیں جتنا حزن و ملال کا۔ غالب نے وہ مرثیہ جس کی ردیف "ہائے ہائے" ہے غالباً اس عورت کی موت پر کہا ہے۔ غالب کا غم ایک صحت مند انسان کا غم ہے۔ غم عشق ہو یا غم دوراں، اُس کے غم میں مرض پسندی (——— morbility) کا احساس نہیں پایا جاتا۔ عشق کے اس تجربے نے غالب کو اس کی مختلف کیفیات سے روشناس کر دیا تھا لیکن غالب کا ذہن تجربہ کی لذت میں ڈوب کر نہیں رہ جاتا بلکہ وہ عشق و محبت کی نفسیاتی تحلیل بھی کرتا ہے اور اس سے نکتے اخذ کرتا ہے جو اس کے اشعار میں ڈھل جاتے ہیں۔ وہ عشق کے مختلف مدارج اور مراحل پر گہری نظر ڈالتا ہے۔ وہ عشق کی مجبوری اور بے بسی سے بھی آگاہ ہے اور اس کی خودداری اور استغنا کی شان سے بھی واقف ہے۔ اس کا ذہن عشق کو زندگی سے مربوط

اور ہم آہنگ پاتا ہے۔ اور اس "خانہ ویران ساز" کو روح ہستی قرار دیتا ہے۔ عشق کے ان تصورات نے غالب کی عشقیہ شاعری کو بڑی شاعری بنا دیا ہے۔ میر آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دینے کے گُر سے واقف ہے، وہ اپنے معجز بیان سے اپنے غم کو عالمگیر حقیقت بنا دیتا ہے لیکن غالب کی وہ کائناتی بصیرت " ـــ Cosmic Vision ، جو اس کے عشق کو عشق اور اس کی عاشقانہ شاعری کو عاشقانہ شاعری بناتی ہے، میر کیا کسی کو بھی نصیب نہیں ـــــــ اس دور میں آزردہ اور شیفتہ بھی ہمیں نظر آتے ہیں۔ آزردہ "سودائے عشق میں" تمام تلف" دیکھتا ہے "اور "دو جہان کے زیاں" کو بھی زیاں نہیں سمجھتا، شیفتہ محبت میں سینے کے اندر آگ سی لگی ہوئی پاتا ہے۔ ان دونوں شاعروں کے کلام میں عشق اور عشق کے معاملات اور اس کے حزنیہ اور نشاطیہ پہلو دونوں ملتے ہیں، ان کے عشق کا تصور محض مجازی ہے، یہ ضرور ہے کہ کبھی یہی عشق مجازی کو عشق حقیقی سے لیجا کر ملا دیتے ہیں۔

متاخرین کے دور میں جو نام خاص طور سے زبان پر آتے ہیں وہ امیر اور داغ، حالی (جہاں تک اس کی قدیم غزل گوئی کا تعلق ہے) اور مجروح ہیں، امیر کے پہلے دیوان "مرآۃ الغیب" میں ناسخ اسکول کی خارجیت کا پورا اثر ہے،

دوسرا دیوان "صنم خانہ عشق" جو امیر نے داغ کے رنگ میں لکھا ہے، اس میں نسبتاً بہتر عشقیہ اشعار ملتے ہیں، لیکن وہ بھی داغ کی نقالی سے زیادہ کچھ نہیں، امیر عالم اور صوفی تھا۔ اور اس لئے تصوف کا پرتو بھی اس کی شاعری میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، اس کے عاشقانہ اشعار بے جان اور بے روح ہیں۔ وہ عشق کے تجربے سے نابلد ہے، اس کی شاعری میں مجازی عشق کا تصور ہے لیکن وہ محض رسمی اور تقلیدی، داغ البتہ پکا عشقیہ شاعر ہے اس کی شاعری خالص عاشقانہ شاعری ہے، لیکن اس کے عشق کا تصور بھی لذت پرستی پر مبنی ہے۔ جنسی خواہشات کی تکمیل اس کے عشق و محبت کا مقصود ہے، جائز یا ناجائز کی تفریق اس کے یہاں نہیں ہے اور "مٹی کی بھی ہو تو رولے شباب میں" اس کا فتوائے عشق ہے کہ داغ کو زنان بازاری سے عمر بھر لگاؤ رہا۔ اس کوچے کی خاک اس نے بہت چھانی ہے۔ کلکتہ کی ایک طوائف حجاب سے جو رامپور آئی ہوئی تھی اُسے تعلق خاطر بھی رہا ہے اور اس پر ایک مثنوی "فریاد داغ" بھی کہی ہے۔

داغ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ طوائفوں کو اپنے روبرو بٹھا کر شعر کہتے تھے۔ یہ بات صحیح ہو یا غلط، اس میں شک نہیں کہ اس کے کلام میں طوائفوں کے ناز و انداز اور عشوہ و غمزہ عطر میں بسے ہوئے ہیں۔ داغ کی ادا بندی اور معاملہ بندی جرأت کے رنگ سے ملتے ہوئے بھی اس سے الگ ہے۔ جرأت کے یہاں ادا بندی میں لکھنؤ کے اثر سے خارجیت نمایاں ہے۔ داغ کی ادا بندی میں خارجی رنگ کے بجائے داخلی کیفیات مترشح ہوتی ہیں۔ اس کی شاعری ـــ Poetry of Behaviourism. کہے جانے کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ مجروح کی شاعری میں عشق کا عام مجازی تصور ہے۔ مروجہ خیالات کو صفائی اور ستھرائی سے ادا کیا گیا ہے۔ اس دور میں داغ اور مجروح کی شاعری ہی "بلبل کی ترانے" کی حیثیت رکھتی تھی۔ حالی کی عاشقانہ شاعری اس کی قدیم غزل گوئی تک محدود ہے۔ اس کے یہاں عشق و محبت کا تصور سیدھا سادا اور نیچرل ہے جسے وہ اتنے ہی سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرتا ہے ؎

عشق کہتے ہیں جسے سب وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

حالی معاملات عشق کا ماہر ہے لیکن اس کے لہجہ میں عشق کی بے چارگی اور درماندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں ایسا اثر ہے جو مدھم سروں میں ہوتا ہے۔ بالآخر سرسید کے زیر اثر حالی نے عشق و محبت کا موضوع ترک کر درد وطن اور سوز ملت کو اپنا لیا اور خوبرو جوانوں سے اس کا رم کرتا ہوا دل ایک دو پیر دیرینہ سال سے وابستہ ہو گیا ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

یش پال

ادیبوں کے لئے ڈالر کا جال

انگریزی کے ماہوار رسالوں میں دلچسپی رکھنے والے قارئین میں سے شاید ہی کوئی "ریڈرز ڈائجسٹ" سے ناواقف ہو۔ یہ رسالہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتا ہے۔ اس جریدہ کے امریکن، یوروپین اور کئی دوسرے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ اپنے لکھنے والوں کو "ریڈرز ڈائجسٹ" سینکڑوں ہزاروں کی رقمیں دیتا ہے۔

اس اخبار کی خاصیت یہ ہے کہ ہر ایک شمارہ میں بہت ہی منجھے ہوئے ڈھنگ کے دو مضمون سوویت روس اور سوشلزم کے خلاف دیئے جاتے ہیں۔ ان مضامین میں نام نہاد غیر جانب داری کا بھی ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔

لوئی آراگان فرانس کے مقتدر ادیب، اور شاعر ہیں۔ آراگان کمیونسٹ ہیں۔ اس جنگ عظیم میں فرانس کے جرمنی سے ہار جانے کے بعد وہاں جو فاشسٹ دشمن خفیہ تحریک فرانس کی آزادی کے لئے کمیونسٹوں کی رہنمائی میں چلائی گئی تھی۔ اس میں آراگان نے بہت بڑا حصہ لیا تھا۔

اس تعارف کے بعد "ریڈرز ڈائجسٹ" اور آراگان کے درمیان جو مراسلت ہوئی ہے اُسے ملاحظہ فرمایئے "ریڈرز ڈائجسٹ" کے لئے مضامین اکٹھے کرنے والے دلال نے آراگان کو ایک خط لکھا۔ خط کا مضمون یہ ہے۔

چیکس شامبرن ان
ففتھ ایونیو۔ نیو یارک۔

جناب من!

آپ "ریڈرز ڈائجسٹ" سے واقف ہیں آپ نے اس کا یورپی ایڈیشن دیکھا ہوگا۔ ہمارا جریدہ آپ کے قلم سے ایک مضمون شائع کرنیکا خواہش مند ہے۔ آپ چاہیں تو کسی خاص فرد کے بارے میں جو آپ کو خاص طور پر پسند ہو، لکھ سکتے ہیں یا روزانہ زندگی کے کسی پہلو کو لے سکتے ہیں۔

مجھے "ریڈرز ڈائجسٹ" کے مدیر اعلیٰ مسٹر ڈی وٹ والیس کا خط ملا ہے وہ بخوشی اس مضمون کا معاوضہ دو ہزار ڈالر (۶ ہزار روپے) دینے کے لئے تیار ہیں بہتر یہ ہوگا کہ آپ مضمون کے ایک صفحہ کا عکس لطیف "ریڈرز ڈائجسٹ" کے ڈیٹر کو بھیج دیں وہ فوراً ہی آپ کو اطلاع دیںگے کہ مضمون ان کے پڑھنے والوں کو پسند آئیگا یا نہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ آپ کے مضمون کا موضوع کوئی خاص فرد ہی ہو۔ آپ کسی بھی ایسے عام آدمی کی زندگی لے سکتے ہیں جو روزانہ زندگی میں نرم دلی اور خلوص کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے۔ اگر آپ کے مضمون کا عکس لطیف مدیر اعلیٰ کو منظور ہوا تو اس صورت میں بھی آپ کو بارہ سو روپے آپ کی محنت کے لئے ضرور پہنچ جائیں گے۔

میں امریکہ میں تندرست مُردا اور سامر ست ماہم کا بھی نمائندہ ہوں، اگر آپ کا یہ کام میری معرفت پورا ہو جاتا ہے تو میں آپ کے معاوضے کی رقم سے دس بفصدی کمیشن لوں گا۔

شکریہ کے ساتھ
آپ کا۔ جیکس شامبرن

اس خط کے ساتھ مثال کے طور پر جو مضمون اخباروں سے کاٹ کر بھیجے گئے تھے ان میں "وینٹ شیس" کا مضمون "میلر لزکا" اور نوبل پرائز پانے والی "مگریٹ تھر کی مصنفہ پرل بک کا "ہمیشہ یاد رہنے والا انسان" تھے۔ مضمون بڑے نہیں تھے۔ پہلا مضمون تین صفحے کا اور دوسرا لگ بھگ دس صفحے کا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک صفحے کے مختصر مضمون کے لئے بارہ سو روپے اور پانچ چھ صفحے کے مضمون کے لئے آٹھ ہزار روپے کم نہیں ہوتے۔ لیکن لوئی آراگان نے اس کا جواب یوں دیا۔ مجھے اکثر یاد آنے والا شخص ایک دن میرے دفتر میں آیا تھا ان دنوں میں شام کو شائع ہونے والے ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ کمرے کی دیواریں سفید کاغذ سے مڑھی ہوئی تھیں۔ پردے بھی سفید تھے۔ اور نکل کا فرنیچر تھا۔ جس پر چمڑا مڑھا ہوا تھا۔ اس بات کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ جبکہ دو برس بعد "ولادینے" کی پولیس کیمونسٹوں کی پکڑ دھکڑ کر رہی تھی تو اس نے اس دفتر پر بھی دھاوا بولا اور وہ فرنیچر بھی اُٹھا لے گئی تھی۔

۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نہ بھولنے والے اس شخص کا قد لمبا، بال بھورے اور مونچھیں چھوٹی تھیں۔ وہ کسی فلمی اخبار میں کام کرتا تھا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ لیکن بہت برس بیت چکے تھے۔ اس نے اپنے آنیکا مطلب سیدھے سادے انداز میں بیان نہیں کیا۔ لیکن میں بھانپ گیا تھا۔ اس وقت ہمارے اخبار میں، نازی فلموں (یوفا فلم کمپنی) کا پردہ فاش کرنے والے کئی مضامین شائع ہو رہے تھے وہ خود یہودی تھا لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ یوفا میں کام کرتا ہے۔ اس کا دفتر شانی لی سس میں ہے۔ وہ برلن آتا جاتا رہتا ہے۔ اور ڈاکٹر گوئبلز سے بھی اس کی ملاقات ہے۔ اس نے کہا

"آپ تصور کیجئے۔ میں ڈاکٹر گوئبلز سے ملنے جاتا ہوں۔ اس سے ملنے کے لئے بھیڑ میں جب میرا نام پکارا جاتا ہے تو میں فخر سے اونچا سر کر کے انہیں اپنی لمبی یہودی ناک دکھا دیتا ہوں۔ نازی اردلی تعظیم سے آکر میرا کوٹ تھام لیتے ہیں"، لیکن یہ قصہ سنانے کے لئے ہی وہ نہیں آیا تھا۔ اس نے اس کے بعد کہا کہ میں نے سینما کے لئے کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی۔ اگر میں کوشش کروں تو ہرج ہی کیا ہے۔

میں نے جواب دیا، "مجھے اس کا تجربہ نہیں ہے۔ کبھی یہ کام کیا نہیں ہے۔ جس موضوع کو جانتا نہیں ہوں اس میں دخل دینے سے کیا حاصل"

اس نے فوراً ہی جواب دیا، "صاحب کرنے سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ آپ اس بات کی فکر نہ کیجئے۔ ہمارے پاس آدمی ہیں۔ وہ سب کچھ کر لیں گے آپ صرف تین چار صفحوں میں مختصر کہانی کا خاکہ لکھ دیجئے۔ اسے پورا کرنے کے اور ڈائیلاگ لکھنے کے لئے دوسرے آدمی ہیں۔ تین چار صفحے کے اس خاکے کے لئے ہم آپ کو تین لاکھ فرانک (دس ہزار روپیہ) دیں گے آپ تیار ہوں تو میں ابھی آپ کو ایسی تین مختصر کہانیوں کا آرڈر کمپنی کی طرف سے دیئے دیتا ہوں"

مہربانی کا یہ بوجھ اُٹھاتے میں میں نے اپنی معذوری ظاہر کی اور اٹھ کر "تعظیم" کے ساتھ اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ "کہئے تو میں نیچے تک راستہ دکھاؤں"

یہاں تک کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان حضرت کا دوسرا رُخ ۱۹۴۵ء میں نظر آیا۔ جب فرانس جرمن فوجوں کے شکنجے سے چھوٹ چکا تھا۔ ان دنوں فرانس میں نازی حکومت سے نجات پانے کے سلسلے میں فلمیں دکھائی جا رہی تھیں۔ حالانکہ فلم بنانے والے اس قسم کی نازی دشمن فلمیں بنانے سے ہچکچاتے تھے۔ کیونکہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دو ماہ میں سرکار کا رُخ کیا ہوگا۔ اس لئے عوامی جذبے سے فائدہ اٹھانے کے لئے جنگ آزادی کی جو نازی دشمن فلمیں اس وقت فرانس میں دکھائی جا رہی تھیں ان میں پابندی لگانے کے قابل کوئی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ان فلموں میں جنگ آزادی میں کیمونسٹوں کی قیادت اور ان کے پروگرام پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی۔ اور ان میں عوام میں جوش کی چنگاریاں بھرنے والے، انقلابی گیت گاتے ہوئے نوجوان مہینوں میں ہزاروں

بھوکے قیدیوں کے ساتھ "انٹرنیشنل" گانے والے بہادر قیدیوں کے منظر نہ تھے۔ نازیوں کی طرف سے مار دینے کے لئے کھڑے کئے جانے پر بھی، جمہوریت کے فتح کے نعرے لگانے کے سین نہ تھے۔ یہ تصویریں "معصوم" تھیں اور قانون کی گرفت سے باہر تھیں۔ پھر بھی خواہش ہوئی کہ ان فلموں کی کہانی کو کس نے لکھا ہے۔

پتہ لگا کہ یہ صاحب میرے سنہ ۳۷ء کے وہی یہودی مہمان تھے جنہوں نے مجھے تیس ہزار روپے کی محنت کا کام کچھ صفحوں پر قلم چلا دینے کے لئے دلانا چاہا تھا، اور مجھے "بھینٹ" کرنے کی کوشش کی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اگر میں "ریڈرز ڈائجسٹ" کے لئے ایک صفحہ گھسیٹ دوں تو مجھے بارہ سو روپیہ مل سکتے ہیں۔ اور اگر پانچ چھ صفحے لکھ لوں جو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور اس کے مدیر اعلیٰ کو ناپسند آنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے، تو شامبرن صاحب کا کمیشن کاٹ کر سوا چھ ہزار نقد مل سکتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ "ریڈرز ڈائجسٹ" کا یہ سودا بہت کچھ ویسا ہی ہے جیسا کہ سنہ ۳۷ء میں یونا کمپنی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اگر اس وقت میں ۳۵ ہزار روپے لیتا تو مجھے یونا کمپنی کی فلموں پر تنقید کرتے وقت جھجک محسوس ہوتی۔ اور اگر آج میں "ریڈرز ڈائجسٹ" کے سوا چھ ہزار روپیہ لے لوں تو امریکن ڈالر کے سامراجی منصوبوں کے مکروہ چہرے پر سے پردہ اٹھانے میں مجھے جھجک محسوس ہونے لگے۔

یہ تو ہوئی میرے اپنے تجربے کی بات لیکن میں نہیں جانتا "ریڈرز ڈائجسٹ" کے مدیر اعلیٰ کو جو روزانہ زندگی میں "نرم دلی اور فیاضی" کا ثبوت پیش کر سکنے والے ایک عام آدمی کے خاکے کی تلاش تھی۔ وہ اس مذاق سے پوری ہوتی ہے یا نہیں۔

"ریڈرز ڈائجسٹ" کے دلال تھیلی بھر روپیہ دکھا کر ادیبوں کی تلاش میں ہیں۔ میرے جیسے ادیبوں کے بجائے انہیں میرے سنہ ۳۷ء کے یہودی مہمان کی ہی تلاش کرنی چاہئے۔ بندوق کی نالی کے سامنے اپنی ہی بات پر اڑے رہنے والے بہادر لوگوں سے ان کا کام پورا نہ ہوگا۔ مجھے راستہ دکھانے اور میرا بھروسہ حاصل کرنے کے لئے وہ آندرے موروا اور سامرسٹ ماہم کے ناموں کا حوالہ دے رہے ہیں۔ ان ادیبوں کے راستے بھی انہیں جیسے ہیں۔

آندرے مارشل پتان کی قوم فروش پالیسی کے حامی رہے ہیں۔ اور سامرسٹ سنہ ۱۹۱۶ء میں برطانیہ کے خفیہ پولیس کے محکمہ میں کمیونسٹوں پر نگرانی کا کام کیا کرتے تھے۔ میں ان ادیبوں سے رہنمائی کا سبق نہیں لینا چاہتا ہوں۔

روپیہ بڑا مفید ہے۔ بڑی خوبصورت چیز بھی ہے روزانہ زندگی اس کی ٹھوس زمین پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ لیکن روپیہ ادیبوں کو۔ ان کے فن کو، ان کے خیالوں میں آگ بھرنے والے جذبات کو خرید نہیں سکتا۔ روپیہ نرم دلی اور خلوص پیدا کر سکتا ہے اور خرید بھی سکتا ہے۔

"ریڈرز ڈائجسٹ" کے مدیر اعلیٰ آپ کو اس کی کیا کمی ہے۔ تو پھر یہ تلاش کس لئے؟ لیکن کمیونسٹ ادیب آپ کی پسند کے لئے ایک صفحہ کا مختصر خاکہ نہیں لکھیں گے۔ وہ ضرور لکھیں گے مگر کمیونسٹ جذبات کی کہانی لکھیں گے۔ لوٹ کھسوٹ ظلم و تشدد کا پردہ فاش کرنے والی کہانی ———!

اعتذار

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ ستمبر کا "افکار" بھوپال پریس کی خرابی اور کسی دوسرے پریس کے فوری انتظام نہ ہونے کی وجہ سے نہایت تاخیر سے شائع ہوا جس سے ہمیں کافی نقصان پہونچا۔ ہمارے سرپرستوں کو بھی یقیناً ستمبر کا افکار دیکھ کر بے حد مایوسی اور کوفت ہوئی ہوگی ——— یقین کیجئے ہم اس اتفاقی اور ناگزیر صورت حال کے لئے خلوص دل سے معذرت خواہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہم یہ کہنے پر بھی مجبور ہیں کہ بھوپال کے پریس اب دم توڑ رہے ہیں ——— علوی پریس کے یہاں صرف ایک بھتر رہ گیا ہے ——— سنٹرل انڈیا پریس بند ہے ——— بھوپال پریس کا انتظامی عملہ آج تک معیاری طباعت کے ذرائع اختیار کرنے سے معذور رہا ہے ——— ان پریسوں کے علاوہ صرف ایک گورنمنٹ پریس بچا تھا، جہاں مشکل تمام ہم اس مرتبہ افکار کی طباعت کا انتظام کر سکے ہیں ——— یہ تلخ حقیقت کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ "افکار" ہندوستان کے گنے چنے رسالوں میں سے ہے اور ادبی حلقے ہر قیمت پر اس کے روایتی معیار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جس کا ہمیں بخوبی احساس ہے۔

امید ہے کہ ہمارے ایجنٹ صاحبان، خریدار حضرات اور دوسرے سرپرست اس "افکار" پر بد دل نہ ہوں گے اور بدستور "افکار نوازی" فرماتے رہیں گے۔ تاکہ ہر قسم کے حالات میں ہم افکار کو زندہ رکھ سکیں۔

مینجر

ش ۔ ع

اس بار

کتابیں

آنکھ مچولی

شکیلہ اختر کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شکیلہ اختر ملک کی ممتاز خواتین میں ہیں۔ آنکھ مچولی کے تقریباً تمام افسانے ترقی یافتہ عورت کے رومانی، اخلاقی، نفسیاتی اور اس کی عام معاشرت کے گرد گھوم رہے ہیں۔ زبان و بیان کی لطافت نے ان افسانوں کو حقیقت کے تلخ و شیریں رنگوں کی آمیزش سے کافی مؤثر اور جاندار بنا دیا ہے۔ بعض افسانے جن میں "اعتراف"۔ "مدو جزر"۔ "آنکھ مچولی" اور "بیچاری" بطور خاص قابل ذکر ہیں ——— عورت اور مرد کی نفسیات کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ شکیلہ اختر نے اپنے افسانوں کے تانے بانے ماحول اور معاشرہ سے بُنے ہیں جن میں تصنع کم اور صداقت زیادہ ہے۔ بعض جگہ کتابت کی غلطیاں بُری طرح کھٹکتی ہیں۔ سفید چکنا کاغذ۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات ۱۹۲۔ سرورق کشش انگیز قیمت عہ/ (دو روپے آٹھ آنے)۔

ملنے کا پتہ:۔ نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹیڈ۔ اپالو بندر بمبئی۔

کانچی ہاؤس

ماہر القادری کا ناول ہے۔ ماہر القادری بحیثیت شاعر کے زیادہ مشہور ہیں ——— اور ادیب کی حیثیت سے کم ——— پچھلے چند سالوں سے اُنھوں نے نثر کی طرف بھی توجہ دینا شروع کر دی ہے۔ چنانچہ اُن کی عام شاعرانہ حیثیت کی طرح نثر میں بھی اُن کا مخصوص اصلاحی نقطۂ فکر ہمارے سامنے ہے۔ کانچی ہاؤس کو اگر ادبی معیار سے جانچا جائے تو ہم اس ناول کو "بلند پایہ" یا "غیر معمولی" نہیں کہہ سکیں گے۔ لیکن جہاں تک اصلاحی اور اخلاقی قدروں کا تعلق ہے ——— کانچی ہاؤس ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس ناول کا پلاٹ اچھوتا تو نہیں مگر طرز نگارش تسلسل اور روانی نے اسے کافی دلچسپ بنا دیا ہے چونکہ ماہر ترقی پسند تحریک کے سخت مخالف ہیں۔ اس لئے کانچی ہاؤس بھی ترقی یافتہ رجحانات سے محروم ہے۔ سفید چکنا کاغذ۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ سرورق غیر دلچسپ۔ صفحات ۲۷۰۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹیڈ۔ اپالو بندر۔ بمبئی۔

سچی باتیں

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے حکیم ہلال اکبری نے مرتب کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد ملک کے صاحب طرز انشاء پرداز ہیں۔ اُن کی تحریریں بلا کا اثر اور زور رکھتی ہیں۔ سچی باتیں ——— اخبار "سچ" اور "صدق" میں مسلسل شائع ہو کر عوام و خواص میں مقبول ہو چکی ہیں۔ حکیم ہلال اکبری نے بڑے سلیقہ اور محنت سے ان مضامین کو کتابی شکل میں مرتب کیا ہے ——— سچی باتیں ——— تین ابواب پر مشتمل ہیں ——— "آیات بینات"۔ "احادیث طیبہ" اور "اسوۂ حسنہ" ——— ہر سہ ابواب میں دین، اسلام اور اصلاح المسلمین جیسے دقیق موضوعات پر مولانا عبدالماجد کے سحر کار قلم نے نہایت دلپذیر انداز میں روشنی ڈالی ہے اور اسلامی روایات کو پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کو درس بصیرت دیا ہے۔ "سچی باتیں" دینی لحاظ کے ساتھ ساتھ علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بھی ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ جس کا مطالعہ اس دور گمراہی میں مسلمانوں کے لئے بطور خاص ضروری ہے۔ سفید چکنا کاغذ۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔ صفحات ۳۳۱۔ قیمت تین روپیہ چودہ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ دکن پبلشرز اینڈ پرنٹرز لمیٹیڈ۔ حیدرآباد دکن

چاند ستارے

تاجدار بھوپال کی پچھلی سالگرہ پر جوہر قریشی نے بھوپال اور بیرون بھوپال کے اردو اور ہندی شعراء کا منتخبہ کلام جو سالگرہ کے مشاعرہ میں پڑھا گیا تھا "چاند ستارے" کے نام سے شائع کیا ہے ——

"چاند ستارے" جوہر قریشی کی اچھی ادبی صلاحیتوں کا ایک قابل مطالعہ مجموعہ ہے جس میں ترقی پسند فنکاروں کے ساتھ ساتھ قدیم رنگ کے پرستاروں کے شاہکار بھی پیش کئے گئے ہیں۔ "چاند ستارے" میں شعراء کی پرکشش تصاویر نے بھی کافی اہمیت پیدا کر دی ہے۔ جیسا کہ خود مرتب نے تسلیم کیا ہے —— "چاند ستارے" عجلت کے باعث شعرائے قدیم و جدید کی صحیح ترتیب اور تصاویر کی عدم تیاری کی وجہ سے بعض کوتاہیوں کا شکار ہو گیا ہے —— ہمیں بھی اس کا افسوس ہے —— تاہم جوہر قریشی کو ہم یہ دوستانہ مشورہ دیں گے کہ وہ ایسی اہم ذمہ داریوں کو بڑی خوشی سے قبول کریں، لیکن ذاتی نمود و نمائش، دوست نوازی، اور سستی شہرت سے اُن کو اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے —— "چاند ستارے" کچھ ایسے ہی جذبات سے آلودہ نظر آتا ہے۔ اس مجموعہ میں اچھی فنکاروں نے حصہ لیا ہے —— ان میں سے چند یہ ہیں: —— جاں نثار اختر، ساغر نظامی، احسن علی خاں، اصغر شعری، وجدی الحسینی، صہبا لکھنوی، عرشی بھوپالی، قدوس صہبائی، کیف بھوپالی، ادیب سہارنپوری، اسد بھوپالی، اختر سعید، رتن کمار، بالکرشن گپتا، مدن موہن، فخری، ذکی دارنی، حامد سعید خاں، ارشد تھانوی، فہمی ترمذی، باسط بھوپالی، فضل سرور، اور دوسرے۔ سفید کاغذ۔ کتابت و طباعت بہترین۔ صفحات ۴۴۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ فردوس الادب۔ چوک۔ بھوپال۔

بہو ساس نمبر

ناہید عالم اور عائشہ صدیقہ مدیرات نسوانی دنیا نے "بہو ساس نمبر" کو کتابی شکل میں پیش کیا ہے جو کتابی سائز کے ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نمبر میں آج کی عورت کے صحیح خدوخال پوری طرح اجاگر نظر آتے ہیں۔ ساس بہو کا رشتہ کوئی معمولی رشتہ نہیں —— چنانچہ اس کے ہر ہر پہلو کو مختلف طریقوں سے جانچا اور پرکھا گیا ہے اور بہترین مشورے پیش کئے گئے ہیں۔ اس نمبر میں عبدالمجید سالک، پروفیسر محمد سرور، سعیدا احمد، شیر محمد اختر، انور عظیم، حسن بانو قزلباش، عقیلہ بیگم، شاد عارفی، ظہور نظر، آنسہ زاہدہ، اختر جامی، مجید لاہوری، ممتاز شیریں، عصمت چغتائی، شریف عنایت اللہ وغیرہ کے بہترین مضامین نظم و نثر شامل ہیں۔ ساس بہو نمبر تین حصوں پر مشتمل ہے —— پہلے میں مضامین، دوسرے میں نظمیں اور تیسرے میں، افسانے، ڈرامے اور خاکے ہیں۔

یہ نمبر ہر لحاظ سے ادارۂ نسوانی دنیا کی بہترین کوشش کہے جانے کا مستحق ہے۔ معمولی کاغذ، کتابت و طباعت گوارا۔ صفحات ۲۵۶۔ قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ نسوانی دنیا —— چابک سواراں اسٹریٹ۔ لاہور

رسالے اور اخبارات

ماہ نو

ملک کے مشہور ادیب وقار عظیم جو تقسیم سے پہلے 'آجکل' میں تھے —— آجکل کراچی سے ماہ نو نکال رہے ہیں "ماہ نو" حکومت پاکستان کا رسالہ ہے جو آجکل کی طرح مخصوص ترتیب و تدوین کے ساتھ باپابندی شائع ہو رہا ہے۔ جدید اور قدیم ادب کا حسین امتزاج، مضامین نظم و نثر کا تنوع اور کتابت و طباعت کی پاکیزگی کے علاوہ چار صفحات کی مستقل تصاویر —— "ماہ نو" کی چند خصوصیات ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ وقار عظیم جیسے مسلمہ ادیب کی موجودگی میں بھی "ماہ نو" کے خالص پاکستانی نگراں کار "کسی ہندو ادیب اور شاعر کو ماہ نو کے صفحات پر دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے —— اگر دنیا کا ادب

تعصب اور ذہنی تنگ دامانی کا شکار ہوجاتا تو آج دنیا میں ادیب ہوتے نہ ادب۔ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ساری دنیا کا ادب اور ساری دنیا کے ادیب ہمیشہ سے ایک دوسرے سے روحانی وابستگی رکھتے آئے ہیں اور ہمیشہ رکھتے رہیں گے ——— ادیب اور اُن کا ادب عالمگیر انسانیت اور عالمگیر اخوت کے ہاتھوں پیدا ہوا ہے ——— اس آفاقیت اور ادبی رفاقت کو مفاد پرستی یا مصلحت اندیشی کبھی ختم نہیں کرسکتی۔ ہم اس ادبی عصبیت پر صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ:-

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

سفید چکنا کاغذ۔ کتابت وطباعت نفیس۔ صفحات ۶۰ قیمت ۸؍ زرسالانہ ؁ (پانچروپے آٹھ آنے)

ملنے کا پتہ:- پاکستان پبلیکیشنز۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۷۰۔ کراچی۔

نغمۂ حیات

پشاور سے یہ ماہنامہ یوسف شاد اور ثریا شاد کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ افسانے، نظمیں اور مقالات زندہ اور صحت مند ادب کے ترجمان ہیں۔ لکھنے والوں میں سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، مخمور جالندھری، رضا ہمدانی، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، نذیر مرزا برلاس، سیف الدین سیف، جمیل ملک، شمیم بھیروی، مقصود زاہدی، اور اختر ہوشیارپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پرچہ کے مضامین نظم ونثر کی افادیت سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن یہ چیز قدرے گراں گذرتی ہے کہ مطبوعہ مضامین نظم ونثر کی دوبارہ اشاعت کیجائے۔ مثلاً مارچ ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں سردار جعفری کی یاد ——— اور جولائی ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں احمد ندیم کی تاریخ ،چھپی ہوئی نظمیں ہیں ——— اگر مطبوعہ چیزوں کی مکرر اشاعت سے احتراز کیا جائے تو نغمۂ حیات جلد ہی اپنی انفرادیت تسلیم کرالیگا۔ معمولی کاغذ۔ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۶۴۔ قیمت ۸؍ زرسالانہ ندارد۔ (غالباً چھ روپے)۔ ملنے کا پتہ:- دفتر نغمۂ حیات، محلہ خویشگی پشاور۔

نیا سنسار

اس ہفت روزہ ہندی اخبار کے ایڈیٹر قاسم علی شاستری ہیں جو ہندی کے اعلیٰ تعلیمیافتہ ہیں۔ "نیا سنسار" مہاتما گاندھی کی تعلیمات اور اُن کی مثالی زندگی کے اتحاد پرور نصب العین کا علمبردار ہے ——— نیا سنسار بہترین ترتیب وتدوین کے ساتھ باپابندی شائع ہو رہا ہے۔ آج کے رجحانات اور مقتضیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختر عباس مالک اخبار 'نیا سنسار' کا یہ اقدام ہمیں امید ہے کہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا اور ہندی زبان سے واقف حضرات 'نیا سنسار' کی سرپرستی فرماکر اُن کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ قیمت ۴؍۔ زرسالانہ پانچ روپے (ص؍)۔

ملنے کا پتہ:- دفتر نیا سنسار۔ عبداللہ مینشن۔ چوک۔ بھوپال۔

ہلچل

یہ ہفتہ وار جہاں قدر چغتائی کی ادارت میں بھوپال سے شائع ہوا ہے جس کا پہلا شمارہ ہمارے پیش نظر ہے۔ بھوپال میں معیاری کتابت وطباعت کے عدم انتظام کے باعث "ہلچل" بھی دوسرے جرائد کی طرح ناتمم کتاں ہے۔ تاہم "ہلچل" کی ترتیب وتدوین اُس کے روشن مستقبل کی غمازی کر رہی ہے ——— ہمیں جہاں قدر چغتائی کی ادبی صلاحیتوں پر اعتماد ہے اور اسی اعتماد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'ہلچل' اگر پابندئ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا تو بہت جلد ملک کے ہر حصہ میں مقبولیت حاصل کرلے گا۔ قیمت ۳؍۔ زرسالانہ تیرہ روپے۔

ملنے کا پتہ:- دفتر 'ہلچل'۔ سلطانیہ روڈ۔ بھوپال۔

کتب ورسائل موصولہ

ایک گرجا ایک خندق ——— از کرشن چندر
اسلامی تحریک کا مجاہد ——— جعفر تھانیسری
مضراب کراچی - سنگ میل، پشاور - چندن، کانپور - پرواز لائلپور
گیت، دہلی - ساغر، لاہور - منزل، کراچی - بچوں کا اخبار، لاہور - چاند، لاہور - سکھ ساگر، دہلی۔
شیدا، دہلی - نئی روشنی، دہلی - پیام سحر، کراچی

فلمستان

نام کی چوری

فلمی دنیا میں یہ خبر نہایت حیرت سے سنی جائیگی کہ انڈیا فلم کارپوریشن لمٹیڈ بھوپال نے "نئی ریت" کی تکمیل سے پہلے اپنے دو فلموں کی تیاری کا اعلان کرکے اپیا کے انگریزی رسالہ "دی فلم انڈسٹری" میں سب سے پہلے "ہلچل" نامی فلم کو باضابطہ رجسٹر کرا لیا تھا ـــــ لیکن اگست ۱۹۴۳ء کے فلم انڈیا میں پروڈیوسر کے آصف نے بھی ایس کے اوجھا کی ہدایت کاری میں "ہلچل" نامی فلم کی تیاری کا اعلان کر دیا ہے۔ ایس کے اوجھا ـــــ وہی فلم ڈائرکٹر ہیں جنھوں نے اس سے قبل انڈیا فلم کی "نئی ریت" کو تیار کیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس پردۂ زرنگاری میں انھیں کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر صاحبان عام طور پر تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہیں جس کا بدیہی نتیجہ "ہلچل" کی چوری ہے۔ کیا پروڈیوسر آصف اور ڈائرکٹر اوجھا "ہلچل" کے نام اور رجسٹریشن سے واقف نہ تھے ـــــ ؟!۔ وہ یقیناً واقف تھے مگر ذہنی بیچارگی اور غور و فکر کی تہی دامانی کو کیا کہا جائے ـــــ کہ انھیں اس سے بہتر نام نہ مل سکا۔

معلوم ہوا ہے کہ انڈیا فلم کارپوریشن کے کارکنان نے اپیا کو اس کھلی ہوئی چوری کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ اس بات کا ارادہ کر چکے ہیں کہ اگر نیشنل تھیٹرز کے مالک آصف نے اس نام کو تبدیل نہ کیا تو وہ قانونی کارروائی سے بھی دریغ نہ کریں گے کیونکہ "ہلچل" انڈیا فلم کارپوریشن کا رجسٹر شدہ نام ہے اور کسی کمپنی کو اپیا کے قانون کے مطابق کسی رجسٹر شدہ نام کو اپنانے کا حق نہیں پہونچتا ہے ـــــ امید کہ نیشنل تھیٹرز والے اس معاملہ کو زیادہ بڑھنے نہ دیں گے اور فوراً نام کی تبدیلی کا اعلان کر کے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں گے۔

فلم لینڈ لمیٹیڈ

موجودہ دور کے سب سے بڑے انسان مہاتما گاندھی کے متعلق فلم یہ ادارہ "مہاتما گاندھی کا پیغام" کے نام سے فلما رہا ہے۔ اس کہانی کا بنیادی تخیل نواب سرور علی خاں فیروز جنگ بہادر والی کوروائی اسٹیٹ کا ہے اور بیگم مزمل نے اس حسین تخیل کو ایک فلمی کہانی کی شکل میں لکھا ہے اور مزمل خورشید اپنی بیگم کی اس کہانی کو فلما رہے ہیں۔ اس کے پروڈیوسر بھی آپ ہی ہیں۔ اسکرین پلے مسٹر ذبک ایڈیٹر ساؤنڈ نے لکھا ہے۔ گانے ہندوستان کے مشہور شعراء حضرات جوش ملیح آبادی، بہزاد لکھنوی، احسن رضوی، جہاں قدر چغتائی محمود سروش نے تحریر کئے ہیں۔ نواب جنجیرا کے شاہی گویئے خان صاحب عابد حسین خاں اس میں میوزک دے رہے ہیں اور نیلا چٹنس ششی کلا۔ مزمل اور جلو اس میں کام کر رہے ہیں۔

پنجاب فلم کارپوریشن

پروڈیوسر ڈائرکٹر ولی کی "پدمنی" شمالی ہند میں نمائش کے لئے پیش کر دی گئی ہے۔ ولی صاحب کی اگلی فلم "پتلی" جس میں ممتاز شانتی، یعقوب، پران اور ممتاز علی کام کریں گے، عنقریب سیٹ پر چلی جائیگی۔ "پتلی" کا میوزک ماسٹر غلام حیدر دیں گے۔ ولی صاحب کی تیسری فلم کا نام "برادری" تجویز ہوا ہے۔ جس کی کاغذی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔

لاہور

میٹرو پالیٹن فلم لمیٹیڈ کا انوکھا شاہکار "لاہور" جسے جواں سال ہدایت کار ایم۔ ایل۔ آنند فلما رہے ہیں، بمبئی ٹاکیز کے نگار خانہ میں منزل پر منزل طے کر رہا ہے۔ کرن دیوان اور نرگس اس کے نمایاں کردار ہیں۔ ماسٹر شیام سندر لاہور کا میوزک دینے کے بعد غیر فانی شہرت کے مالک ہو جائیں گے کیونکہ جس نے بھی اس کی دھنیں سنی ہیں بہت متاثر ہوا ہے۔

سہاگ رات

ورنیشل پکچرز کی نفسیاتی پیشکش "سہاگ رات" جسے کیدار شرما نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ آجکل بھوپال ٹاکیز بھوپال میں کافی رش لے رہی ہے۔

Estd:—1945

Regd. No. N. 939o.

THE AFKAR BHOPAL

Bombay Office:—
264, Bellasis Road,
BOMBAY 8.

Hyderabad Office:—
448, Gun Foundry.
HYDERABAD (Dn.)

Karachi Office:—
Mcleod Road,
KARACHI.

VOL. 8 | OCTOBER 1948. | NO. 2



الجیریا کا نخلستان